مقامِ حدیث

مؤلف

مولانا محمد علیؒ

احمدیہ انجمن لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فہرست مقام حدیث

	مضامین	صفحہ نمبر
❀	فہرست مقام حدیث	ا
❀	تمہید مقام حدیث	1
❀	پہلا باب: صداقت حدیث پر اندرونی و بیرونی حملے	4
✿	حدیث پر اندرونی اور بیرونی اعتراض:	4
✿	میور کا خیال کہ حدیث جنگوں میں قصہ گوئی سے پیدا ہوئی	5
✿	جنگی شغل والے صحابہ کی حدیث میں روایت	5
✿	بخاری میں کثرت روایات علمی اشغال والے صحابہ سے ہے	6
✿	مولوی عبداللہ چکڑالوی کے خیالات کہ حدیث سینکڑوں برس بعد بنی	8
✿	ان خیالات کا عقلی محال	10
❀	دوسرا باب: صداقت حدیث پر خارجی شہادت	17
✿	مکتوب آنحضرت ﷺ بنام مقوقس	17
✿	اصل خط کی دریافت	20

	مضامین	صفحہ نمبر
۞	الفاظ حدیث اور عکس کا مقابلہ	21
۞	آنحضرت ﷺ کی مہر	22
۞	مہر کا نقش مطابق حدیث اور اس کا عکس سے مقابلہ	25
۞	احادیث میں پیشگوئیاں	27
۞	شام وایران کی فتح کی پیشگوئی	28
۞	احادیث کی وہ پیشگوئیاں جو کتب حدیث کی اشاعت کے بعد پوری ہوئیں	30
۞	فتح قسطنطنیہ کی پیشگوئی	31
۞	خروج نار کی پیشگوئی	32
۞	ترکوں سے مسلمانوں پر تباہی آنے کی پیشگوئی	36
۞	آخری زمانہ کے متعلق پیشگوئیاں	38
❀	تیسرا باب: ضرورتِ حدیث	40
۞	فہم قرآن میں ہم حدیث کے محتاج ہیں	40
۞	خدا قوانین کا محتاج نہیں مگر انسان ہے	41
۞	قرآن کے مفصل ہونے کے باوجود مولوی عبداللہ کی تشریحات	43
۞	قرآن میں بین السجدتین بیٹھنے کا حکم	45
۞	قرآن میں تکبیر کے وقت کان پکڑنے کا حکم	47

	مضامین	صفحہ نمبر
۞	قرآن سے نماز کی رکعتوں کی تعداد	50
۞	نئے اہل قرآن اوران کی نماز	53
۞	مولوی صاحب اوران کے شاگردوں میں اختلاف باوجود یکہ قرآن مفصل ہے	54
۞	عالم اسلامی کاارکان نماز پر اتفاق	55
۞	فروعی اختلافات	58
۞	نبی کے دوالگ الگ کام۔آیات کاپڑھنااوران کی تعلیم دینا	59
۞	تعلیم کامفہوم	60
۞	قرآن کاپڑھنااوراس کابیان دونوں کام اللہ نے اپنے بتائے ہیں	61
۞	بیان کامفہوم	63
۞	قرآن کریم مفصل ہے مگر مزید تشریح کی ضرورت ہے	64
۞	﴿وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ سے مراد	65
۞	اصول اورفروع کافرق	69
۞	قرآن کریم میں متشابہات کی حکمت	72
۞	باریکیوں کواخذ کرنے والوں کے مدارج کااختلاف	74
۞	نبی کافہم وحی خفی ہے	75
۞	نبی کو خاص فہم دیا جاتا ہے	77

	مضامین	صفحہ نمبر
❁	نبی کو امور دینی میں فیصلہ کرنے کا اختیار	80
❁	حَکَم کے ماتحت حَکَم	82
❁	قرآن میں اطاعت رسول کا ذکر	84
❁	مولوی عبداللہ کی اطاعت رسول کی تفسیر	86
❁	واضح کی تفسیر مبہم سے	88
❁	تفسیری واوٗ	93
❁	وحی خفی کا ذکر قرآن شریف میں	94
❁	قرآن شریف میں نماز اور وضو کے ذکر سے وحی خفی پر کھلا استدلال	95
❁	وحی کے تین رنگ	96
❁	وحی خفی پر دو اعتراض:	99
❁	اوّل: آنحضرت ﷺ سے وقوع سہو یا غلطی	99
❁	دوم: وحی خفی کی حفاظت قرآن شریف کی طرح کیوں نہ ہوئی؟	101
❀	چوتھا باب: جمع حدیث	103
❁	جمع حدیث پر اعتراض	103
❁	زمانہ نبوی میں ضرورت حدیث	104
❁	حفاظت حدیث کے لیے آنحضرت ﷺ کا خود تاکید کرنا	105
❁	آنحضرت ﷺ کے مسائل دینی کو سمجھانے اور یاد کرانے کیلئے دہرانے کی عادت	110

	مضمون	صفحہ نمبر
۞	جھوٹی حدیث پر وعید	112
۞	صحابہ کا بیانِ حدیث میں سخت احتیاط سے کام لینا	113
۞	روایت حدیث میں سب صحابہ یکساں نہیں	116
۞	ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا اشتیاق حفظ حدیث	117
۞	پہلی صدی کے آخر عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے احکام حفاظت حدیث کیلئے	121
۞	صحابہ کا حدیث کی صحت معلوم کرنے کے لیے لمبے سفر کرنا	123
۞	آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے بعض احادیث کا تحریر میں آجانا	125
۞	عام طور پر حدیث کے نہ لکھا جانے کی وجوہات	128
۞	عربوں کا حافظہ پر بھروسہ	130
۞	آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد جمع حدیث کا شوق	133
۞	جمع حدیث کے پانچ مرحلے:	135
۞	پہلا مرحلہ: خود زمانہ نبوی ہے	135
۞	دوسرا مرحلہ: زمانہ صحابہ ہے	136
۞	تیسرا مرحلہ: زمانہ تابعین اور درسگاہوں میں تدریس حدیث	140
۞	چوتھا مرحلہ: حدیث پر تصنیفات	142
۞	پانچواں مرحلہ: جمع حدیث کے کام کی تکمیل	143

	مضمون	صفحہ نمبر
۞	ان پانچوں مرحلوں کے بغیر جمع حدیث کا کام نامکمل رہتا	145
❀	پانچواں باب: تنقید حدیث	147
۞	میور اور سپرنگر کی رائے محدثین کی تنقید حدیث پر	147
۞	محدثین کے قرار دادہ اصول تنقید حدیث	149
۞	محدثین نے اندرونی شہادت اور قرائن سے کام لیا	153
۞	روایت کی تنقید مزید احتیاط کے لیے تھی	154
۞	علم جرح اور تعدیل کی بنیاد ابتدا سے رکھی گئی	155
۞	کن حالات میں روایت کو قبول نہ کیا جاتا تھا	156
۞	محدثین نے ایک دوسرے سے آزاد رہ کر تنقید کی	159
۞	حدیث میں اختلافات	160
۞	محدثین کا شاہان وقت کے اثر کے ماتحت نہ ہونا	163
۞	غلطی کا امکان	164
۞	بخاری کی فضیلت	166
۞	امام بخاری کے اصول تنقید کی سختی	167
۞	عیسائی بزرگوں کا دین کی خاطر جھوٹ بولنے کو جائز رکھنا	167
۞	امام بخاری کے ننانوے حدیثوں میں سے ایک کو لینے کے معنی	169
۞	صحاح ستہ کے سوا دیگر کتب احادیث میں تنقید میں تساہل	170

	مضمون	صفحہ نمبر
۞	کیاہم روایت یادرایت کی رو سے تنقید حدیث نہیں کر سکتے ؟	172
۞	حدیث موضوع کا پتہ کس طرح لگ سکتا ہے؟	173
۞	تنقید حدیث کے پانچ موٹے اصول	173
۞	روایت میں وہ حصہ جس میں قیاس کو دخل دیا گیا ہے	175
۞	تعامل میں آئی ہوئی احادیث اور دوسری احادیث میں فرق	176
۞	روایت میں غلطی کا احتمال	178
۞	روایت بالمعنی	180
۞	صداقت حدیث کے پرکھنے کے لیے سب سے بڑا معیار	182
۞	قرآن کو حدیث پر مقدم کرنے کی ضرورت	184
۞	خود حدیث سے قرآن کریم کے حدیث پر مقدم کیا جانے کا ثبوت	189
۞	قرآن کریم احادیث کے نقص کا علاج کرتا ہے	192
۞	غور وفکر کی ضرورت	192

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

تمہید مقامِ حدیث

اس زمانہ میں مخالفین اسلام کے حملوں کو چھوڑ کر خود مسلمانوں نے حدیث کے معاملہ میں افراط وتفریط سے کام لیا ہے اور اس کے صحیح مقام کو جس پر سلف قائم تھے اور جس کی طرف خود قرآن وحدیث ہم کو ہدایت کرتے ہیں نہیں سمجھا۔ ایک طرف وہ گروہ ہے جس نے حدیث پر اس قدر زور دیا ہے کہ آخر آہستہ آہستہ قرآن شریف چھوٹ گیا۔ پھر کمزور سے کمزور حدیث کی بنا پر اصول دین تک کی پروا نہیں کی جاتی جو صراحت سے قرآن شریف میں مذکور ہیں اور حدیث کو قرآن شریف کے ماتحت کرنے کے خیال کو حدیث کی بے ادبی سمجھا جاتا ہے۔ ایسا ہی بروئے درایت یا عقلی طور پر تنقید حدیث کو ایک جرم خیال کیا جاتا ہے۔ اور جو کچھ رطب و یابس کمزور سے کمزور احادیث میں ہے اس کو اصول دین کے برابر وقعت دے کر اس پر اعتراض کرنے والے کو دین اسلام کا منکر یعنی کافر قرار دیا جاتا ہے۔ مقام حدیث کے متعلق اسی غلو کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس زمانہ میں ایک گروہ مسلمانوں کا ایسا پیدا ہوگیا ہے جنہوں نے بالمقابل تفریط کی راہ

اختیار کر کے حدیث کی صداقت کا بکلی انکار کر دیا ہے۔ اور خطرناک سے خطرناک حملہ جو کسی دشمن کو کبھی کرنے کی جرأت نہ ہوئی ہو اس سے بہت بڑھ کر حملہ صداقت حدیث پر مسلمانوں کے اس گروہ نے کیا ہے جو اپنے آپ کو اہل قرآن کہتے ہیں۔ ان لوگوں نے نہایت بے باکی سے حدیث کو سرتاپا مجموعہ ہزلیات اور مفتریات قرار دیا ہے۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِكَ۔ اس لیے مجھ کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ برادران اسلام کے لیے اس بارہ میں صحیح راہ پیش کروں۔ تاکہ جس دین کو ہم دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں خود بھی اس کے اصول صحیحہ سے واقفیت حاصل کریں۔

میں نے اس مضمون کو پانچ بابوں میں تقسیم کیا ہے:

بابِ اوّل میں یہ بتایا ہے کہ صداقت حدیث پر اندرونی اور بیرونی دشمنوں نے کیا حملے کیے ہیں؟ اور وہ حملے ایک سرسری تاریخی نگاہ سے کس سلوک کے مستحق ہیں؟

بابِ دوم میں صداقت حدیث پر دو قسم کی خارجی شہادت پیش کی ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حدیث کی حفاظت میں اس کے بیان کرنے والوں نے کس قدر احتیاط سے کام لیا ہے۔

بابِ سوم میں ضرورت حدیث کے مضمون کو بیان کیا ہے۔ یعنی یہ بتایا ہے کہ قرآن شریف کے ہوتے ہوئے حدیث کی کیا ضرورت ہے اور کیوں حدیث کو وحی خفی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

بابِ چہارم میں جمع حدیث کا مضمون ہے۔ یعنی یہ بتایا ہے کہ حدیث کی کس طرح حفاظت کی گئی؟ کب اس کو جمع کرنے کا کام شروع ہوا؟ اور کن مرحلوں میں سے گزر کر یہ تکمیل کو پہنچا؟

بابِ پنجم میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ محدثین نے کس طرح علاوہ تنقید روایت کے بروئے درایت بھی حدیث کی تنقید کی ہے اور اب ہمارے لیے حدیث کی تنقید کے کیا سامان ہیں؟ اور کس حد تک ہم حدیث کو قبول کر سکتے ہیں؟

محمد علی

اس کتاب کی طبع ثانی کی ضرورت محسوس ہونے پر میں نے اس پر دوبارہ نظر کی ہے اور بعض بعض مقامات پر خفیف تغیر و تبدل بھی کیا ہے۔

محمد علی

12۔ جون 1932ء

پہلا باب

صداقت حدیث پر اندرونی اور بیرونی حملے

حدیث پر اندرونی اور بیرونی اعتراض:

حدیث کی صداقت اور اعتبار پر اس زمانہ میں دو قسم کے حملے ہوئے ہیں۔ ایک بیرونی اور دوسرے اندرونی۔ بیرونی حملے سر ولیم میور اور سپرنگر وغیرہ عیسائی مصنفین کی طرف سے ہوئے ہیں۔ اور اندرونی حملے مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی اور ان کے ہم خیال لوگوں کی طرف سے اور کسی قدر آزاد خیال لوگوں کی طرف سے ہوئے ہیں۔ بظاہر یہ قیاس ہونا چاہئے تھا کہ اندرونی خیالات کا اثر بیرونی لوگوں پر پڑا ہو، مگر یہاں صورت اس کے خلاف ہے۔ اور نہ صرف یہی بلکہ جہاں بیرونی حملہ آوروں کو ایک حد تک حدیث کی صداقت اور اعتبار کا اعتراف ہے۔ اندرونی حملہ آور سارے عظیم الشان مجموعہ حدیث کو جس کے اندر بہت سا علم دین اور آنحضرت ﷺ اور آپ کے برگزیدہ اصحاب کے حالات محفوظ ہیں ایک تنکے کے برابر بھی وقعت نہیں دیتے۔ بلکہ تمام کی تمام احادیث اور ان کے ہر ایک لفظ یا فعل کو جو نبی ﷺ کی طرف منسوب کیا گیا ہے آپ پر بہتان و افترا قرار دیتے ہیں۔ اس مختصر رسالہ میں دونوں قسم کے اعتراضات کا جواب ہوگا۔

میور کا خیال کہ حدیث جنگوں میں قصہ گوئی سے پیدا ہوئی:

سر ولیم میور اپنی کتاب لائف آف محمد (ﷺ) میں احادیث کی بحث میں لکھتے ہیں:

> ''محمد (ﷺ) کی وفات کے بعد ان کے پیروؤں کا سب سے بڑا شغل جنگ تھا۔۔۔لمبی تھکا دینے والی مہمات جنگی کی ثقالت اور ایک جنگ کے بعد دوسری جنگ تک بیکاری کا وقفہ ایک سادہ اور نیم وحشی قوم کے لیے غفلت شعاری کا موجب تھا۔اسی ثقالت کے دور کرنے کا علاج اور ان وقفوں کا شغل بے تکلف بات چیت یا باقاعدہ گفتگو میں گزشتہ واقعات کی یاد تھی۔ ابتدائی زمانہ کے مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ پُرجوش گفتگو کا مضمون سوائے اس شخص کے اقوال اور افعال کے اور کیا ہوسکتا تھا جو اس فاتح قوم کے وجود میں آنے کا موجب ہوا تھا اور جس نے ان کے ہاتھ میں اس دنیا اور بہشت دونوں کی کنجیاں دے دی تھیں۔اس طرح پر محمد (ﷺ) کے پیروؤں کی گفتگو زیادہ تر انہی کے متعلق ہوتی تھی ۔۔۔۔۔یہ وہ مواد تھا جس سے حدیث نے خوب ترقی کی۔''

جنگی شغل والے صحابہ کی حدیث میں روایت:

اس مضمون میں میور نے بڑی رنگ آمیزی سے کام لیا ہے۔مگر اکثر عیسائی

مصنّفین کی طرح گو اس خیال کی ایجاد میں انہوں نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیا ہے اور اس کو خوب سجا کر ایک خوش نما رنگ میں پیش کیا ہے، جس سے ایک ناواقف آدمی کو ٹھوکر لگ سکتی ہے۔ لیکن واقعاتِ تاریخی پر ایک سرسری نگاہ میور صاحب کی اس رنگ آمیزی کا فیصلہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ کیونکہ اس کی بنیاد اس بات پر رکھی گئی ہے کہ جنگوں کے اندر بے شغلی کے زمانہ میں یہ کہانیاں ایجاد ہوئیں؛ تاکہ نکمّے لوگوں کا وقت ان قصہ گوئیوں میں گزر جائے اور بوجھل معلوم نہ ہو۔ حالانکہ جب ہم واقعات کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی روایت میں ان لوگوں کا حصہ عشر عشیر سے بھی بہت کم ہے جن کا تعلق جنگوں سے تھا۔ بلکہ بیشتر حصہ احادیث کا ان صحابہ سے مروی ہے جن کا کام علوم دینی کی اشاعت اور درس وتدریس تھا۔ اور بڑے بڑے فاتحین اور سپاہیوں کی روایات کو اگر کوئی تلاش کرنا چاہے تو بہت ہی کم احادیث ان سے ملیں گی۔ ایک حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو ہی لے لو، جن سے سب سے زیادہ حدیثیں مروی ہیں۔ ان کا تعلق جنگوں سے کوئی نہ تھا، نہ وہ جنگوں میں شامل ہوئے۔ لیکن کل مجموعہ حدیث میں جن کی تعداد بلاتکرار کنز العمال میں بتیس ہزار ہے۔ پانچ ہزار تین سو چوہتر حدیثیں ان سے مروی ہیں یعنی چھٹے حصے سے بھی زیادہ۔

بخاری میں کثرت روایات علمی اشغال والے صحابہ سے ہے:

دوسری طرف حدیث کی سب سے معتبر کتاب کو لے لو اور دیکھو کہ اس میں ایسی

حدیثیں کس قدر ہیں جن کی روایت ان صحابہ تک پہنچتی ہو جو جنگوں میں بہت حصہ لینے والے تھے اور ایسی احادیث کس قدر ہیں جو ان صحابہ تک پہنچتی ہوں جو جنگوں میں شریک نہ ہوتے تھے؟ دونوں قسموں میں سے پانچ چھ بڑے بڑے صحابہ کو لے لو۔ ایک طرف خالد بن ولید، ابوعبیدہ، ابوسفیان، یزید بن ابوسفیان، عکرمہ، ضرار ابن الازور ہیں۔ اور ان کے مقابل دوسری طرف ابوہریرہ، انس بن مالک، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، عائشہ صدیقہ اور خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم ہیں۔ اول الذکر گروہ میں سے بخاری میں صرف ایک حدیث ابوسفیان کی آئی ہے اور مؤخر الذکر گروہ میں سے حضرت ابوہریرہ کی 446، انس بن مالک 268، عبداللہ بن عمر 270، عبداللہ بن عباس 217، حضرت عائشہ صدیقہ 242، دوسری عورتیں 73، حضرت عمر 60، حضرت علی 49، حضرت ابوبکر 22، حضرت عثمان 9۔ کل 1,646 ہیں۔ مقام غور ہے کہ یہ کتنا بڑا جھوٹ میور صاحب نے حدیث پر اعتراض کرنے کے لیے لکھ دیا ہے کہ جنگوں میں شامل ہونے والے لوگ قصہ گوئی کے طور پر حدیثیں بنالیا کرتے تھے؟ حالانکہ قصہ گوئی اور کہانت یہ وہ دو ہتھیار ہیں جو اسلام کے خلاف اس کے دشمنوں نے استعمال کئے اور اسلام نے ان دونوں کا عرب میں سے خاتمہ کر دیا۔ یہ موقعہ زیادہ تفصیل کا نہیں۔ ہاں اس سے مجھے انکار نہیں کہ جنگوں میں شریک ہونے والے صحابہ سے بھی احادیث مروی ہیں جو نسبتاً بہت کم ہیں۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ کوئی تنخواہ دار سپاہی نہ تھے کہ ساری عمر ہی ان کی جنگوں میں صرف ہوئی ہو بلکہ علمی اشغال بھی رکھتے تھے۔ اور یہ

نبی کریم ﷺ کا کمال تھا کہ جہاں ان کو فاتح بنایا اور ملک گیری سکھائی ساتھ ہی حکمت اور علم کی چاشنی بھی لگا دی۔

مولوی عبداللہ چکڑالوی کے خیالات کہ حدیث سینکڑوں برس بعد بنی:

دشمن اگر زیادتی کرے تو اس پر اس قدر الزام نہیں جس قدر اس نادان دوست پر ہے جو اپنے ہاتھ سے اس شاخ کو کاٹتا ہے جس پر وہ بیٹھا ہوا ہے۔ وہ پاک علوم، وہ نبی کریم ﷺ کے اعلیٰ درجہ کے اخلاق، وہ پاکیزگی اور طہارت کی باتیں جن سے حدیث بھری پڑی ہے، ان کے متعلق ''اہل قرآن'' کے پیش رو مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی کی طرف سے ذیل کا فتویٰ صادر ہوتا ہے:

> ''فی الحقیقت حدیث میں اس قدر لغویات، ہزلیات اور دور از کار اور بے سروپا باتیں مندرج ہیں کہ وہ اس کی شکل کو نہایت ہی بدنما بناتی ہیں۔ لیکن واضعین احادیث نے یہ بڑی کاریگری کی کہ اس کو خاتم النبیین ﷺ کی طرف منسوب کر دیا اور اس طرح اس کے بدشکل چہرہ پر سفیدہ مل دیا۔''
>
> (برہان الفرقان:109)

> ''نہ صرف زمانہ محمد رسول اللہ سلام علیہ کے لوگ ہی کتاب اللہ کے مقابلہ میں احادیث انبیاء پیش کرتے تھے۔ بلکہ یہ ملعون کام اس

سے بھی پرانا ہے۔۔۔فرعون بھی اہل حدیث ہی تھا اور موسیٰ کے مقابلہ میں یوسف کی احادیث پیش کرتا تھا اور ان کو ختم المرسلین جانتا تھا''۔ (برہان الفرقان:17)

''حدیث کی تشریح وتفصیل کتاب اللہ المجید کے سراسر مخالف ہے ۔۔۔۔۔اس وجہ سے مجھے اس بارہ میں شک ہوا کہ حدیث محمد رسول اللہ ﷺ کا قول،فعل،تقریر نہیں ہے۔۔۔اور میں نے دیکھا کہ وہ ایک نہایت ہی کریہہ النظر، بدصورت، زشت رو، بدشکل، مصنوعی چیز ہے۔ اس کو رسول اللہ ﷺ سے کوئی تعلق نہیں۔آپ کی وفات سے سینکڑوں برس پیچھے بعض خودغرض لوگوں نے ازخود یہ ہزلیات گھڑلیں اور کمال سیاہ دلی سے ان کو ناحق محمد رسول اللہ ﷺ کے ذمے لگا دیا ہے۔ یہ کام زیادہ تر بعض یہودی و نصاریٰ دشمنان اسلام کا معلوم ہوتا ہے جنہوں نے اسلام کی بیخ کنی کی یہ بہترین راہ سوچی کہ وہ مسلمانی کے لباس میں لوگوں کو قرآن حکیم کی طرف سے ہٹا کر اور طرف لگا دیں تاکہ ان میں بھی وہی کفریات جاری ہوجائیں جو خود ان کے باطل مذاہب میں موجود تھیں۔''(الزکوٰۃ والصدقات:12و13)

''غرضکہ جملہ کتب منزل من اللہ میں ہر ایک کتاب خصوصاً قرآن

مجید جملہ احکام وتمام مسائل دین اسلام کے بارہ میں مباح تک بھی ہر طرح کامل، مکمل، مفصل ومشرح کافی شافی وافی عافی ہوتی ہے۔ان کے کسی مسئلہ میں اجمال واشکال نہیں ہوا۔''

(مناظرہ:18)

''اسلام کی ہر ایک چیز من کل الوجوہ مفصل ومشرح طور پر بیان ہوگئی ہے تو اب وحی خفی یا حدیث کی کیا حاجت رہی۔ بلکہ اس کا ماننا اور دین اسلام میں اس پر عملدرآمد کرنا سراسر کفر، شرک، ظلم، فسق ہے۔۔۔۔ماسوائے احسن الحدیث کے یعنی کتاب اللہ المجید کے باقی سب کی سب احادیث دین اسلام کے بارہ میں جو مروی ہیں وہ ہر ایک لہوالحدیث میں ہی داخل ہیں۔محمد رسول اللہ ﷺ عموماً جملہ رسل انبیاء علیہم السلام پر محض لوگوں کے افترا وبہتان ہیں۔''

(مناظرہ:19و20)

ان خیالات کا عقلی محال:

اب اس معترض کے نزدیک حدیث کا کوئی وجود آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں نہ تھا۔نہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ کے کوئی اقوال وافعال محفوظ رکھے نہ آگے کسی کو پہنچائے۔نہ تابعین کے دل میں کبھی یہ خیال پیدا ہوا کہ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کے تاریخی حالات

ان کے اقوال و افعال، ان کے فتاویٰ، ان کے کارنامے محفوظ رکھیں۔ نہ تبع تابعین کے دل میں ایسا وہم وگمان پیدا ہوا۔ بلکہ پہلی یا دوسری صدی ہجری میں ان باتوں کا کوئی نام ونشان نہ تھا۔ اور آنحضرت ﷺ کی وفات سے ''سینکڑوں برس پیچھے بعض خودغرض لوگوں نے یہ ہزلیات گھڑ لیں اور کمال سیاہ دلی سے ان کو ناحق محمد رسول اللہ ﷺ کے ذمے لگا دیا۔'' شاید اس قول کے قائل سے بڑھ کر نادان دوست اسلام کا کوئی ہی ہوا ہوگا؟ بھلا کون عقلمند اس کو قبول کرسکتا ہے؟ کہ آنحضرت ﷺ کی وفات سے سینکڑوں برس تک آپ کے اقوال کو کسی نے محفوظ نہیں رکھا اور پھر دو تین صدیاں بعد اسلامی ممالک کے ہر گوشے میں جو ہزاروں میلوں میں شمالاً جنوباً اور شرقاً غرباً پھیلے ہوئے ہیں۔ جن کی حدا گر ایک طرف ایشیا میں انتہائے مشرق میں پہنچ چکی ہے تو دوسری طرف یورپ میں انتہائے مغرب میں پہنچ چکی ہے۔ جب مختلف ممالک میں مختلف سلطنتیں قائم ہوچکی ہیں۔ جب مشرق کے رہنے والے مغرب کے حالات سے ناآشنا اور مغرب کے رہنے والے مشرق کے حالات سے ناآشنا ہیں۔ ان عظیم الشان وسیع ممالک میں یک لخت کوئی ایسی ہوا چلتی ہے کہ معاً ہر جگہ کچھ لوگ پیدا ہوتے ہیں جو دل سے کچھ اقوال و افعال گھڑ کر اور پھر راویوں کے نام گھڑ کر اور صحابہ کے نام بھی گھڑ کر ہر ایک قول وفعل کے ساتھ ایک سلسلہ روایات قائم کر دیتے ہیں اور اس کو ایسی ترویج دیتے ہیں کہ ایک طرف اگر چین میں یا ایران میں وہ روایت اس سلسلہ اسناد سے مروی ہے تو دوسری طرف ہسپانیہ میں وہی روایت اسی سلسلہ اسناد سے شہرت پا جاتی ہے۔ اور اس زمانہ میں ایک بھی نیک دل

انسان، ایک بھی خدا ترس مسلمان نہیں رہا جو مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی کی طرح یہ آواز اٹھائے کہ اے لوگو! خدا کا خوف کرو۔ کل تک ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ آنحضرت ﷺ کا کوئی قول و فعل تھا نہ کسی صحابی، تابعی یا تبع تابعی کا نام ہم جانتے تھے۔ آج تم نے معاً ہزاروں کی تعداد میں نام اور واقعات گھڑ کر اور اقوال بنا کر ان کو رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب کر دیا ہے اور ایک نئی نماز بنالی ہے اور زکوٰۃ کے نئے قواعد گھڑ لیے ہیں۔ کیا ایسی سازش پہلے بھی کبھی دنیا پر کسی نے دیکھی یا سنی کہ جس بات کا نام و نشان تک نہ ہو اس پر فوراً ایک اتنی بڑی عمارت تیار کر کے کسی نامعلوم طریق سے ایک مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی اور کل عالم پر محیط قوم کی روزمرہ کی زندگی میں داخل کر دیا جائے اور سب لوگ باوجود یہ جاننے کے کہ کل تک ہم کو ان باتوں کا علم بھی نہ تھا پھر کروڑوں کی تعداد میں بغیر ایک جگہ اکٹھا ہونے کے اتفاق کر لیں کہ نہیں فی الواقع ہمارا اور ہمارے آباواجداد کا اور ان کے آباواجداد کا یہی عملدرآمد چلا آتا ہے۔ اور تعجب یہ کہ مولوی عبداللہ صاحب تو ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی وفات سے سینکڑوں برس پیچھے یہ باتیں گھڑی گئیں اور ہم کو دوسری صدی ہجری کی کتنی تصنیفات ملتی ہیں جن میں حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی مؤطا بھی ایک ہے۔ جن میں وہ واقعات لکھے ہوئے موجود ہیں جو ابھی سینکڑوں برس بعد گھڑے جانے تھے۔ اور مولوی صاحب کے فرضی عیسائی یا یہودی کے دماغ میں آنے سے پیشتر وہ حدیثیں آئمہ دین کی لکھی ہوئی کتابوں میں موجود ہیں۔ ہاں اس خیال کو ایک ہی صورت

میں کوئی انسان جس کے سر میں خدا نے وہ گودا رکھا ہے جس سے انسان سمجھ اور فکر کا کام لیتا ہے قبول کرسکتا ہے کہ وہ یہ سمجھ لے کہ ساری تاریخ باطل ہے۔ جو کچھ تیرہ سو سال میں لکھا گیا وہ سب جھوٹ۔ اس میں ایک حرف صداقت کا نہیں۔ اور تیرہ سو سال بعد جو خیال مولوی عبداللہ صاحب کے سر میں آ گیا وہی سچ ہے۔ حق تو یہ ہے کہ یہ خیال جس کو مولوی صاحب نے اس قدر زور شور سے پیش کیا ہے ایسا لچر ہے کہ ایک موٹی سے موٹی عقل کا انسان جس کے اندر ادنیٰ فکر کا مادہ بھی ہو اسے ایک لمحہ کے لیے قبول نہیں کرسکتا۔ اور مولوی صاحب یا ان کے ہم خیالوں کے خیالات:

خیالات نادان خلوت نشیں
بہم برزند عاقبت کفرد دیں

کا مصداق ہیں۔ بھلا اگر اتنی بڑی سازش ہوسکتی ہے تو کیا یہ موجودہ قرآن اسی سازش کا نتیجہ نہیں ہوسکتا۔ پھر تو یوں کہنا چاہئے کہ نہ کوئی محمد رسول اللہ ﷺ ہوئے نہ کوئی ان پر قرآن اترا۔ نہ کوئی صحابہ ہوئے نہ کوئی اسلامی سلطنت ہوئی۔ یہ سب کچھ نعوذ باللہ عیار لوگوں نے گھڑ کر باتیں بعد میں مشہور کردیں۔ ہمیں مسلمانوں کے منہ سے یہ باتیں نکلتی ہوئی دیکھ کر رونا آتا ہے اور پھر اسی عقلمندی کے برتے پر اور تاریخ کا اس طرح سراسر انکار کردینے پر سمجھا جاتا ہے کہ ہم نے اسلام پر سے کل اعتراضات اٹھا دیئے اور سب دنیا فوراً اب مسلمان ہوجائے گی۔ یاد رکھو حدیث کے اس انکار سے جس کی بنیاد مولوی عبداللہ صاحب نے رکھی ہے کل تاریخ اسلامی کا جس کو دنیا کی بہترین تاریخ ہونے کا فخر ہے انکار لازم آتا

ہے۔ اور اس کے انکار کے ساتھ ہی کل تاریخ کا ہی انکار ہے۔ پھر تو کوئی بھی گزشتہ واقعہ درست نہیں۔

پھر میں کہتا ہوں کہ اگر ایک طرف صحابہ اور تابعین کا دامن ان افتراؤں کے بنانے سے پاک ہے بلکہ تبع تابعین کا بھی جیسا کہ مولوی عبداللہ صاحب کے ''سینکڑوں برس پیچھے'' کے اقرار سے ثابت ہے اور دوسری طرف محدثین کرام پر بھی اس افترا کا الزام نہیں دیا جاسکتا۔ جیسا کہ مولوی صاحب نے تسلیم کیا ہے اور دوسری صدی کے اختتام سے پیشتر تبع تابعین کی تصنیفات اب بھی موجود ہیں۔ تو وہ درمیانی زمانہ کون سا ہوا؟ جب یہودیوں اور عیسائیوں نے قرآن سے لوگوں کو ہٹانے کے لیے حدیثیں وضع کیں۔ آخر کوئی نیا خیال جب دنیا میں پیش کیا جائے تو اس کے لیے دو باتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ خود اس کے اندر کوئی معقولیت ہو۔ دوسرے یہ کہ اس کی تائید اور ذرائع سے ہوتی ہو۔ اب جہاں تک معقولیت کا سوال ہے میں حیران ہوں کہ اتنا عظیم الشان تو انقلاب اس خیال کے ذریعہ سے پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ حدیث، سیرت، تاریخ کی تمام کتابیں امام مالک اور ابن اسحاق سے لے کر محض مجموعہ اباطیل ہیں اور اول سے آخر تک جھوٹی روایتوں سے پُر ہیں۔ اور پھر اس کے لیے اتنا بھی معقولیت کا سہارا تلاش کرنے سے نہیں ملتا کہ آخر یہ حدیثیں جن کو امام مالک سے شروع کر کے بخاری اور مسلم اور دیگر محدثین نے جمع کیا۔ اور یہ سیرت اور تاریخ کے واقعات جن کو ابن اسحاق سے شروع کر کے بڑے بڑے آئمہ نے اپنی کتابوں میں لکھا، ان

کے بنائے جانے کا زمانہ کون سا ہے؟ آنحضرت ﷺ کی وفات سے سینکڑوں برس بعد وہ بنتے ہیں۔ یہ تو مولوی صاحب نے فیصلہ کر دیا لیکن آنحضرت ﷺ کی وفات سے دو سو سال کے اندر اندر وہ آئمہ کی کتابوں میں مدون ہو کر موجود ہو جاتے ہیں اس پر خود تاریخ شاہد ہے۔ اب آخر کوئی سو دو سو سال کا عرصہ ان کے بننے اور ان کی تشہیر اور ترویج اور ان پر کل اسلامی دنیا کا عملدرآمد کرانے کے لیے بھی چاہئے۔ افسوس کہ مولوی صاحب نے ایک باطل خیال پیش کر کے بہتوں کو ایک غلط راہ پر تو ڈالا لیکن اتنا بھی غور نہ کیا کہ آخر کوئی زمانہ ان احادیث کی وضع کا بھی تجویز کرنا چاہئے۔ بے سروپا بات پر دین کی بنیاد رکھنا عقلمندی کا شیوہ نہیں اور نہ صرف یہ خیال معقولیت کو ہی دھکے دیتا ہے بلکہ دوسری ضرورت کے بھی پورا کرنے سے عاری ہے۔ یعنی اس کی کوئی تائید کسی طرح بھی نہیں ہوتی۔ ظاہر بات ہے کہ اگر اس قدر عظیم الشان مجموعہ افتراؤں کا کبھی تیار ہوا تھا تو کوئی ایک آدھ آواز ہی دنیا کے کسی کنارے سے اٹھتی۔ عرب، ایران اور شام سے نہ اٹھی تھی تو چین، ترکستان یا جزائر سے ہی اٹھتی۔ افریقہ کے وسیع ممالک یا ہسپانیہ کی اسلامی سلطنت میں ہی کوئی حق پسند پکار اٹھتا کہ یہ حدیثوں کا مجموعہ جو تیار ہوا ہے یا جس کے پھیلانے کی کوشش کی جاتی ہے سراسر افترا ہے۔ ہماری نمازیں یہ نہیں جو ان حدیثوں میں بیان ہوئی ہیں۔ ہماری زکوٰۃ یہ نہیں جس کا ذکر ان احادیث میں پایا جاتا ہے۔ یہ کام فلاں یہودی یا عیسائی کا ہے جو دین اسلام کو برباد کرنے کے لیے کر رہا ہے۔ مگر یہ کیا ہوا کہ کروڑہا انسانوں میں سے جو ہزارہا میلوں اور بیسیوں ممالک میں پھیلے ہوئے تھے

اور الگ الگ زبانیں بولتے تھے ایک شخص کی آواز بھی اس زمانہ میں نہ اٹھی؟ گویا کہ تمام اسلامی دنیا نے سازش کرلی جو ایک ناممکن امر ہے۔ اگر یہ دشمنوں کا کام تھا اور مولوی عبداللہ صاحب کو یہ اعتراف ہے کہ فی الواقع یہ دشمنان اسلام کا کام تھا تو کسی دوست کی آواز ساری دنیا میں ایک کی ہی سہی اس کے خلاف اٹھنی چاہئے تھی۔ آخر ایک ڈیڑھ سو یا دوسو سال کا عرصہ اتنی حدیثوں کے بننے اور ان کے مسلمانوں کے اندر مروج ہونے میں لگا ہوگا۔ پھر ان پانچ چھ نسلوں میں کروڑ در کروڑ مسلمانوں میں سے کیوں کسی ایک شخص کی آواز بھی نہ اٹھی کہ یہ سب کچھ دشمنوں کا کام ہے۔ مسلمان متنبہ ہوجائیں۔ یا کیا یہ ساری نسلیں بھی اسی عرصہ میں سب کی سب بالاتفاق اسلام کی دشمنی پر کمربستہ ہوگئی تھیں؟ اور اسلام کی خیرخواہی کے اکیلے دم بھرنے والے کے لیے یہ مقدر ہوا کہ وہ تیرہ سو سال بعد پیدا ہوکر اندھیرے میں ایک تیر چلائے جس سے اگر کچھ نقصان پہنچ سکتا ہے تو خود اسلام کو ہی اور دشمنان اسلام پر اس کے ذریعہ سے کچھ بھی اتمام حجت نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ وہ کون سا کچا یا احمق اسلام کا دشمن ہے جو محض اس لیے کہ مولوی عبداللہ صاحب نے تیرہ سو سال بعد آکر یہ کہہ دیا ہے کہ تاریخ اسلام تمام کی تمام مجموعہ اباطیل ہے اور اس میں ایک بھی قول نبی ﷺ کا نہیں، نہ کوئی آپ کا فعل ہے؛ آمنا وصدقنا کہہ اٹھے گا اور اس خیال کو طفلانہ قرار دے کر اس پر ہنسی نہیں کرے گا۔

دوسرا باب

صداقت حدیث پر خارجی شہادت

اس باب میں صداقت حدیث کے دو ایسے بے نظیر ثبوتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو پرانے واقعات تاریخی کو شاذ و نادر ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔

مکتوب آنحضرت ﷺ بنام مقوقس:

ان میں سے پہلا ثبوت وہ ہے جو اس رسالہ کے ورق اول سے ملتا ہے۔ جس پر ایک پرانے خط کا فوٹو چھپا ہوا ہے۔ یہ خط وہ ہے جو حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ نے مقوقس شاہ مصر کو لکھا تھا۔ اور ایسے ہی چند اور خطوط دوسرے بادشاہوں کو بھی لکھے گئے تھے۔ یہ واقعہ صلح حدیبیہ کے بعد کا ہے۔ یعنی جب آنحضرت ﷺ حدیبیہ سے 6 سنہ ہجری کے آخر میں واپس آئے تو اس وقت آپ نے بہت سے گرد و نواح کے بادشاہوں کو اسلام قبول کرنے کے لیے دعوتی خطوط لکھے اور یہ خطوط صحابہ رضی اللہ عنہم لے کر ان بادشاہوں کے پاس گئے۔ ان خطوط کا ذکر صحیح بخاری اور مسلم میں اور دیگر کتب احادیث میں پایا جاتا ہے۔ مقوقس شاہ مصر کو جو یہ خط لکھا گیا تھا اس کا مفصل ذکر مواہب لدنیہ اور دیگر سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔ بلکہ اصل عبارت بھی محفوظ ہے۔ مواہب لدنیہ میں مندرجہ ذیل ذکر اس خط کے بھیجنے کا اسی جگہ موجود ہے۔ جہاں دوسرے بادشاہوں کو

خط لکھا جانے کا ذکر ہے:

وَكَتَبَ ﷺ إِلَى الْمُقَوْقِسِ مَلِكِ مِصْرَ وَالْإِسْكَنْدَرِيّةِ وَاسْمُهُ جُرَيْجُ بْنُ مِيْنَآءَ:

بِسْمِ اللهِ الرّحْمَنِ الرّحِيمِ مِنْ مُحَمّدٍ عَبْدِ اللهِ وَرَسُولِهِ إِلَى الْمُقَوْقِسِ عَظِيمِ الْقِبْطِ سَلَامٌ عَلَى مَنْ اتّبَعَ الْهُدَىٰ، أَمّا بَعْدُ: فَإِنّي أَدْعُوكَ بِدِعَايَةِ الْإِسْلَامِ أَسْلِمْ تَسْلَمْ، يُؤْتِكَ اللهُ أَجْرَكَ مَرّتَيْنِ، فَإِنْ تَوَلّيْت فَإِنّ عَلَيْكَ إِثْمَ الْقِبْطِ ﴿يَاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾ [آلِ عِمْرَانَ: 3:64] وَبَعَثَ بِهِ مَعَ حَاطِبِ بْنِ أَبِي بَلْتَعَةَ، فَتَوَجَّهَ إِلىٰ مِصْرَ بِالْإِسْكَنْدَرِيَّةِ.....

فَلَمَّا جِيْءَ بِهِ إِلَيْهِ وَوَقَفَ بَيْنَ يَدَيْهِ وَنَظَرَ فِي الْكِتَابِ نَصَّهُ وَقَرَأَهُ وَقَالَ لِحَاطِبٍ: مَا كَانَ لَهُ إِنْ كَانَ نَبِيًّا أَنْ يَّدْعُوَ عَلَيَّ فَيُسَلِّطَ.....

فَقَالَ لَهُ حَاطِبٌ: وَمَا مَنَعَ عِيْسٰى أَنْ يَّدْعُوَ عَلىٰ مَنْ خَالَفَهُ أَنْ يُّسَلِّطَ عَلَيْهِ،، فَاسْتَعَاذَ مِنْهُ الْكَلَامَ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ سَكَتَ.....

فَقَالَ لَهُ حَاطِبٌ: إِنّهُ قَدْ كَانَ قَبْلَك رَجُلٌ يَّزْعُمُ أَنّهُ الرَّبُّ

الْأَعْلٰى فَأَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْآخِرَةِ وَالْأُولٰى فَانْتَقَمَ بِهِ ثُمّ انْتَقَمَ مِنْهُ فَاعْتَبِرْ بِغَيْرِكَ وَلَا يَعْتَبِرُ غَيْرُكَ بِكَ.....

وَلَعَمْرِي مَا بِشَارَةُ مُوسٰى بِعِيسٰى إِلَّا كَبِشَارَةِ عِيسٰى بِمُحَمّدٍ ﷺ وَمَا دُعَآؤُنَا إِيّاكَ إِلَى الْقُرْآنِ إِلَّا كَدُعَآئِكَ أَهْلَ التَّوْرَاةِ إِلَى الْإِنْجِيلِ.....

فَقَالَ الْمُقَوْقِسُ: إِنّي قَدْ نَظَرْتُ فِي أَمْرِ هٰذَا النّبِيّ فَوَجَدْتُّهُ لَا يَأْمُرُ بِمَزْهُودٍ فِيهِ وَلَا يَنْهٰى عَنْ مَّرْغُوبٍ فِيهِ وَلَمْ أَجِدْهُ بِالسّاحِرِ الضّآلّ وَلَا الْكَاهِنِ الْكَاذِبِ، وَوُجِدَتْ مَعَهُ آيَةُ النّبُوّةِ بِإِخْرَاجِ الْخَبْءِ وَالْإِخْبَارِ بِالنَّجْوٰى وَسَأَنْظُرُ، وَأَخَذَ كِتَابَ النّبِيّ ﷺ فَجَعَلَهُ فِي حُقٍّ مّنْ عَاجٍ وَخَتَمَ عَلَيْهِ وَدَفَعَهُ إِلٰى جَارِيَةٍ لَّهُ.

اس روایت کو ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی کتاب ''اَلْجَوْابُ الصَّحِيْحِ لِمَنْ بَدَّلَ دِيْنِ الْمَسِيْحِ'' میں بیان کیا ہے۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حاتم بن ابی بلتعہؓ آنحضرت ﷺ کا خط بنام مقوقس لے کر اس کے پاس اسکندریہ میں پہنچے۔ اور نہ صرف خط ہی اس کو پہنچایا بلکہ تبلیغ بھی کی۔ اور جب بادشاہ نے یہ اعتراض کیا کہ اگر آنحضرت ﷺ خدا کے نبی ہیں تو وہ کیوں دعا کر کے مجھ پر مسلط نہیں ہوجاتے؟ تو حاطبؓ نے ایسا معقول جواب دیا جس سے بادشاہ شرمندہ ہوگیا۔ یعنی یہ کہ اگر سنت اللہ انبیاء کے متعلق یہی ہوا کرتی ہے کہ وہ بجائے دین حق کی طرف دعوت دینے کے مخالفین

پر بد دعا کر کے ان کو مغلوب کر لیا کریں تو حضرت عیسیٰ نے کیوں ایسا نہ کیا؟ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس خط کو مقوقس نے نہایت حفاظت سے ڈبیہ میں بند کیا اور ایک لونڈی کے سپرد کیا۔ اور دوسری روایت میں ہے کہ مہر لگا کر اپنے خزانچی کے سپرد کیا۔

اصل خط کی دریافت:

مقوقس کے نام کا خط 1858ء میں مصر کی ایک خانقاہ میں جو عیسائیوں کی ہے بعض فرانسیسی سیاحوں کو مل گیا اور اب اصل خط قسطنطنیہ میں محفوظ ہے اور بڑے بڑے عیسائی محققین نے اسے اصلی قرار دیا ہے۔ منجملہ ان کے ڈاکٹر بیجر ہے اور خود اس کے اصلی ہونے کی یہ کچھ کم شہادت نہیں کہ وہ عیسائی خانقاہ میں عیسائیوں کے ہی ہاتھ لگا۔ اب ہم اس اصلی خط کی عبارت کا اس عبارت سے مقابلہ کرتے ہیں جو احادیث میں موجود ہے تا کہ یہ معلوم ہو کہ احادیث نے اصل واقعات اور اصل الفاظ کو کہاں تک محفوظ رکھا ہے۔ اس غرض کے لیے دو کالموں میں یہ دونوں عبارتیں درج کی جاتی ہیں تا کہ ناظرین آسانی سے مقابلہ کر سکیں۔ دائیں طرف کے کالم میں اصل خط کی عبارت کی نقل ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر بیجر نے اسے پرانی رسم الخط سے نئی رسم الخط میں دکھایا ہے۔ اور بائیں کالم میں حدیث کے الفاظ ہیں جو مواہب لدنیہ کی روایت سے لیے گئے ہیں۔ جس کا حوالہ اوپر بھی دیا گیا ہے۔

الفاظ حدیث اور عکس کا مقابلہ:

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ	بِسْمِ اللهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللهِ وَرَسُولِهِ	مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللهِ وَرَسُولِهِ
إِلَى الْمُقَوْقِسِ عَظِيمِ الْقِبْطِ	إِلَى الْمُقَوْقِسِ عَظِيمِ الْقِبْطِ
سَلَامٌ عَلَى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَىٰ،	سَلَامٌ عَلَى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَىٰ،
أَمّا بَعْدُ: فَإِنِّي أَدْعُوكَ بِدَاعِيَةِ	أَمّا بَعْدُ: فَإِنِّي أَدْعُوكَ بِدِعَايَةِ
الْإِسْلَامِ أَسْلِمْ تَسْلَمْ، يُؤْتِكَ	الْإِسْلَامِ أَسْلِمْ تَسْلَمْ، يُؤْتِكَ
اللهُ أَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ فَإِنْ تَوَلَّيْتَ	اللهُ أَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ فَإِنْ تَوَلَّيْت
فَعَلَيْكَ إِثْمَ الْقِبْطِ ﴿ يَاَهْلَ	فَعَلَيْكَ إِثْمَ الْقِبْطِ ﴿ يَاَهْلَ
الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا	الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا
وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ	وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ
بِهٖ شَيْـًٔا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا	بِهٖ شَيْـًٔا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا
اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا	اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا
اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿٦٤﴾ ﴾	اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿٦٤﴾ ﴾

نوٹ: معتبر احادیث میں اس نقش کی مہر بنوائے جانے اور تمام خطوط پر جو بادشاہوں کو بھیجے گئے تھے لگائے جانے کی خبر صحیح موجود ہے۔

اب مذکورہ بالا عبارتوں کو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ان میں مطلق کوئی فرق نہیں۔ سوائے لفظ دَاعِيَةِ اور دِعَايَةِ کے جن کا مفہوم واحد ہے۔ جہاں تک اصل خط کو دیکھا جاتا ہے دَاعِيَةِ پڑھنے والے کی غلطی معلوم ہوتی ہے اور خط میں اصل لفظ دِعَايَةِ ہی معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال اس فرق کو تسلیم بھی کرلیا جائے تو بھی یہ کوئی فرق نہیں ہے بلکہ درحقیقت روایت اور اصل خط میں ایک حیرت انگیز لفظی مطابقت پائی جاتی ہے۔ اور راویوں نے یہاں تک بھی تصرف نہیں کیا کہ اسی مفہوم کو دوسرے لفظوں میں ادا کردیا ہو۔

آنحضرت ﷺ کی مہر:

اس اصل خط میں جو دریافت ہوا ہے ایک بات اور نہایت ہی قابل توجہ ہے۔ خط کے آخر پر ایک مہر ہے جس پر نقش محمد رسول اللہ ہے۔ اب اس مہر کی نسبت تمام معتبر احادیث میں ذکر پایا جاتا ہے۔ اور صرف مہر کے متعلق ہی نہیں بلکہ مہر کے نقش اور اس کی دوسری تفصیلات کے متعلق بھی۔ مہر کے متعلق متواتر روایات آئی ہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری میں بھی یہ حدیث مختلف روایتوں سے بیان کی گئی ہے۔

پہلے باب [دُعَآءِ النَّبِيِّ ﷺ إِلَى الإِسْلَامِ] میں ہے:

عَنْ قَتَادَةَ، قَالَ: سَمِعْتُ أَنَسًا يَّقُولُ: لَمَّا أَرَادَ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ يَّكْتُبَ إِلَى الرُّومِ، قِيلَ لَهُ: إِنَّهُمْ لَا يَقْرَءُونَ كِتَابًا إِلَّا أَنْ يَّكُونَ مَخْتُومًا. فَاتَّخَذَ خَاتَمًا مِّنْ فِضَّةٍ،

فَكَأَنِّي أَنْظُرُ إِلىٰ بَيَاضِهِ، وَنَقَشَ فِيهِ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللهِ.
[صحيح البخاري: 2938]

اور دوسری جگہ كِتَابُ اللِّبَاسِ میں یہ حدیث ان الفاظ میں موجود ہے:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ نَبِيَّ اللهِ ﷺ أَرَادَ أَنْ يَّكْتُبَ إِلَى رَهْطٍ أَوْ أُنَاسٍ مِّنَ الْأَعَاجِمِ، فَقِيلَ لَهُ: إِنَّهُمْ لَا يَقْبَلُونَ كِتَابًا إِلَّا عَلَيْهِ خَاتَمٌ، فَاتَّخَذَ النَّبِيُّ ﷺ خَاتَمًا مِّنْ فِضَّةٍ نَقْشُهُ: ((مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللهِ)). فَكَأَنِّي بِوَبِيضِ أَوْ بِبَصِيصِ الْخَاتَمِ فِي إِصْبَعِ النَّبِيِّ ﷺ أَوْ فِي كَفِّهِ. [البخاري: 5872]

اور اسی باب میں پھر حدیث خاتم کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: اتَّخَذَ رَسُولُ اللهِ ﷺ خَاتَمًا مِّنْ وَّرِقٍ، وَكَانَ فِي يَدِهِ، ثُمَّ كَانَ بَعْدُ فِي يَدِ أَبِي بَكْرٍ، ثُمَّ كَانَ بَعْدُ فِي يَدِ عُمَرَ، ثُمَّ كَانَ بَعْدُ فِي يَدِ عُثْمَانَ، حَتّٰى وَقَعَ بَعْدُ فِي بِئْرِ أَرِيسَ، نَقْشُهُ: ((مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللهِ)). [صحيح البخاري: 5873]

اور پانچویں جگہ پھر یہ حدیث انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت سے ان الفاظ میں موجود ہے:

لَمَّا أَرَادَ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ يَّكْتُبَ إِلَى الرُّومِ قِيلَ لَهُ: إِنَّهُمْ

لَنْ يَّقْرَءُوا كِتَابَكَ إِذَا لَمْ يَكُنْ مَخْتُومًا. فَاتَّخَذَ خَاتَمًا مِّنْ فِضَّةٍ، وَنَقْشُهُ: ((مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللهِ)). كَأَنِّيْ أَنْظُرُ إِلٰى بَيَاضِهِ فِي يَدِهِ. [صحيح البخاري: 5875]

ایسا ہی دوسری کتب صحاح میں بھی یہ حدیث موجو دہے۔ یعنی جب آنحضرت ﷺ نے شاہ روم کو یا عجم کے بادشاہوں کو خطوط لکھنے کا ارادہ کیا تو صحابہ نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ وہ لوگ خط کو نہیں پڑھتے سوائے اس کے اس پر مرسل کی مہر ہو۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ایک مہر چاندی کی تیار کرائی جس پر ((مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللهِ)) نقش کرایا۔ اور اس سے خطوط پر مہر لگائی۔ پھر یہ مہر آنحضرت ﷺ کی زندگی میں آپ کے ہاتھ میں رہی اور آپ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں اور پھر خلیفہ ثالث سے یہ مہر ایک کنوئیں میں گر پڑی، جس کا نام اریس ہے اور پھر نہیں ملی۔ غرضیکہ متواتر روایات سے مہر کا اس موقعہ پر بنوایا جانا ثابت ہوتا ہے۔ اور یہ بھی صفائی سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کا نقش ((مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللهِ)) تھا۔ اب مقوقس کے اصل خط کے دریافت ہونے نے ان تمام احادیث کی صداقت کو اظہر من الشّمس کر دیا ہے۔ کیونکہ اس سے ہمیں یہ پتہ لگتا ہے کہ واقعی خطوط پر مہر لگانے کے لیے ہی یہ مہر تیار کی گئی تھی۔ کیونکہ ان ہی خطوط میں سے جن کا ذکر حدیث میں ہے ایک خط پر یہ مہر موجود ہے اور اس کا نقش بھی وہی ہے جو احادیث میں بیان کیا

گیا ہے۔

مہر کا نقش مطابق حدیث اور اس کا عکس سے مقابلہ:

مگر احادیث سے اس سے زیادہ تفصیلات اس مہر کے متعلق معلوم ہوتی ہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری میں یہ حدیث انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے موجود ہے:

عَنْ أَنَسٍ أَنَّ أَبَا بَكْرٍ لَمَّا اسْتُخْلِفَ كَتَبَ لَهُ، وَكَانَ نَقْشُ الْخَاتَمِ ثَلَاثَةَ أَسْطُرٍ. مُحَمَّدٌ سَطْرٌ، وَرَسُولُ سَطْرٌ، وَاللَّهِ سَطْرٌ. [صحيح البخاري: 5878]

وَزَادَنِي أَحْمَدُ حَدَّثَنَا الأَنْصَارِيُّ قَالَ حَدَّثَنِي أَبِي عَنْ ثُمَامَةَ عَنْ أَنَسٍ قَالَ: كَانَ خَاتَمُ النَّبِيِّ ﷺ فِي يَدِهِ، وَفِي يَدِ أَبِي بَكْرٍ بَعْدَهُ، وَفِي يَدِ عُمَرَ بَعْدَ أَبِي بَكْرٍ، فَلَمَّا كَانَ عُثْمَانُ جَلَسَ عَلَى بِئْرِ أَرِيسَ -قَالَ:- فَأَخْرَجَ الْخَاتَمَ، فَجَعَلَ يَعْبَثُ بِهِ فَسَقَطَ، قَالَ: فَاخْتَلَفْنَا ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ مَعَ عُثْمَانَ فَنَنْزَحُ الْبِئْرَ، فَلَمْ نَجِدْهُ. [صحيح البخاري: 5879]

یعنی حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو آپ یعنی انس ان کے احکام لکھا کرتے تھے۔ یعنی زکوٰۃ وغیرہ کے متعلق اور مہر کا نقش تین سطروں میں تھا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک

سطر، رسول ایک سطر اور اللہ ایک سطر۔ اور اس روایت پر احمد کی روایت میں اس قدر لفظ اور زیادہ ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی مہر آپ کے دست مبارک میں رہی۔ پھر آپ کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں پھر ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں پھر ان کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں۔ پھر جب ایک دن حضرت عثمانؓ چاہ اریس پر بیٹھے تھے تو آپ نے انگوٹھی نکالی اور اس کو ہاتھ میں پھیرنے اور ادھر ادھر کرنے لگے تو وہ گر گئی۔ پھر تین دن تک ہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ اس انگوٹھی کی تلاش میں لگے رہے لیکن انگوٹھی نہ ملی۔

اب اس حدیث سے یہ ایک اور بات معلوم ہوئی کہ انگوٹھی کا نقش ((مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللّٰہِ)) ایک خاص طرز پر لکھا ہوا تھا۔ اور تینوں لفظ الگ الگ سطروں میں تھے اور یہ انگوٹھی جیسا کہ بہت سی روایات سے معلوم ہوتا ہے وہی تھی جو بادشاہوں کے نام خطوط پر مہر لگانے کے لیے تیار کرائی گئی تھی۔ فتح الباری میں اس حدیث کے نیچے بعض شیوخ کے اس قول کو نقل کیا ہے:

"أَنَّ كِتَابَتَهُ كَانَتْ مِنْ أَسْفَلَ إِلٰى فَوْقَ يَعْنِي أَنَّ الْجَلَالَةَ فِيْ أَعْلَى الْأَسْطُرِ الثَّلَاثَةِ وَمُحَمَّدٌ فِيْ أَسْفَلِهَا".

[فتح الباري:جلد10، صفحه 329]

یعنی مہر کی کتابت کی جو تین سطریں بیان کی گئی ہیں۔ ان کی ترتیب نیچے سے اوپر کو تھی یعنی اللہ کا نام سب سے اوپر کی سطر میں اور محمد (ﷺ) سب سے نیچے کی سطر میں۔ اس قول کی تضعیف کی گئی ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ قول کسی حدیث پر مبنی تھا جو ملی نہیں۔ مگر اب اصل خط کے دریافت ہونے نے اس قول کی تصدیق کر کے اس کو صحیح ثابت کر دیا۔ پس اب اگر ہم احادیث کی روایتوں کی بنا پر مہر کو تجویز کرتے تو اس کا نقش بعینہ وہی تجویز کرتے جواب دریافت ہوا ہے یعنی...

اب اس بے نظیر شہادت پر غور کرو جس سے احادیث اسلامی کی صداقت پہلے سے بھی بڑھ کر چمک اٹھی ہے۔ ایک پرانی تحریر کے دستیاب ہونے سے اگر احادیث کا اس سے اختلاف ہوتا تو حدیث پر بڑا بھاری حملہ تھا اور احادیث کی صداقت معرض خطر میں تھی۔ مگر یہی تحریر احادیث کی صداقت پر ایک عظیم الشان گواہ ہوگئی۔ اور نہ صرف ان تمام احادیث کی صداقت ہی اس سے ثابت ہوئی جن میں بادشاہوں کے نام خطوط کا لکھا جانا اور مہر کا بنوانا اور ان خطوط پر لگایا جانا مذکور ہے۔ بلکہ اس واقعہ سے عام طور پر احادیث کی صداقت پر مہر لگ گئی کہ کس قدر سچائی سے صحابہ رضی اللہ عنہم نے واقعات کے بیان کرنے میں کام لیا ہے۔

احادیث میں پیشگوئیاں:

غرضکہ مقوقس والا خط ایک بے نظیر شہادت احادیث کی صداقت پر ہمارے

سامنے پیش کرتا ہے۔مگر اس شہادت کے علاوہ میں احادیث کی صداقت پر ایک اور بے نظیر شہادت اس باب میں پیش کرنی چاہتا ہوں۔ یہ شہادت نہ صرف احادیث کی صداقت پر ہے بلکہ آنحضرت ﷺ کے الفاظ کا منجانب اللہ ہونا ثابت کرتی ہے۔ یہ ہے احادیث میں پیشگوئیوں کا موجود ہونا۔ اگر اسلام کی تاریخ کو ہم تین زمانوں پر تقسیم کریں یعنی ابتدائی زمانہ، درمیانی زمانہ اور آخری یا موجودہ زمانہ تو ان تینوں میں ہم ان پیشگوئیوں کا ظہور کھلا کھلا پاتے ہیں جو احادیث میں مذکور ہیں اور جن سے آنحضرت ﷺ کی صداقت ہر زمانہ میں اپنی چمک دکھاتی رہی ہے اور آپ کی برکات کا ہر زمانہ میں جاری رہنا ثابت ہوتا ہے۔ کفار پر آنحضرت ﷺ اور دین اسلام کے غالب آنے کی پیشگوئیاں کھلے کھلے الفاظ میں قرآن کریم کی مکی سورتوں میں موجود ہیں۔مگر اس جگہ میرا منشا صرف ان پیشگوئیوں کے بیان کرنے کا ہے جو احادیث میں ہیں۔ ایسی پیشگوئیاں بکثرت ہیں۔مگر نمونہ کے طور پر صرف ایک دو ان میں سے پیش کرتا ہوں۔مثلاً حدیث میں یہ پیشگوئی موجود ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم شام اور ایران کو فتح کرلیں گے۔

شام و ایران کی فتح کی پیشگوئی:

یہ پیشگوئی اس وقت کی ہے جب جنگ احزاب کے وقت خندق کھودی جارہی تھی۔ احمد، نسائی، بیہقی، طبرانی نے اس حدیث کو بیان کیا ہے۔ اصل حدیث یہ ہے جس کے اول راوی براء بن عازب رضی اللہ عنہ صحابی ہیں:

قَالَ: لَمَّا كَانَ حِيْنَ أَمَرَنَا رَسُولُ اللهِﷺ بِحَفْرِ الْخَنْدَقِ، عُرِضَتْ لَنَا فِيْ بَعْضِ الْخَنْدَقِ صَخْرَةٌ شَدِيْدَةٌ لَا تَأْخُذُ مِنْهَا الْمَعَاوِلُ، فَاشْتَكَيْنَا ذٰلِكَ إِلَى النَّبِيِّﷺ فَجَآءَ فَأَخَذَ الْمِعْوَلَ فَقَالَ: ((بِسْمِ اللهِ)) ثُمَّ ضَرَبَ ضَرْبَةً فَكَسَرَ ثُلُثَهَا، وَقَالَ: "اللهُ أَكْبَرُ! أُعْطِيتُ مَفَاتِيحَ الشَّامِ، وَاللهِ! إِنِّي لَأُبْصِرُ قُصُورَهَا الْحُمْرَ السَّاعَةَ". ثُمَّ ضَرَبَ الثَّانِيَةَ فَقَطَعَ الثُّلُثَ الْآخر، فَقَالَ: "اللهُ أَكْبَرُ! أُعْطِيتُ مَفَاتِيحَ فَارِسَ، وَاللهِ! إِنِّي لَأُبْصِرُ قَصْرَ الْمَدَآئِنَ الْأَبْيَضَ". ثُمَّ ضَرَبَ الثالثة، وَقَالَ: ((بِسْمِ اللهِ)) فَقَطَعَ بَقِيَّةَ الْحَجَرِ، وَقَالَ "اللهُ أَكْبَرُ! أُعْطِيتُ مَفَاتِيحَ الْيَمَنِ، وَاللهِ! إِنِّي لَأُبْصِرُ أَبْوَابَ صَنْعَآءَ مِنْ مَكَانِي هٰذَا السَّاعَةَ". [مسند الإمام أحمد: 18694]

اور بعض روایتوں میں آخر میں یہ الفاظ آئے ہیں: [فَفَرِحَ الْمُسْلِمُوْنَ وَاسْتَبْشَرُوْا.]

یعنی خندق میں ایک پتھر کو توڑتے وقت آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ ''مجھے شام کی کنجیاں دی گئی ہیں اور میں اس کے سرخ محلوں کو اس وقت دیکھ رہا ہوں۔'' اور پھر فرمایا کہ ''مجھے فارس کی کنجیاں دی گئی ہیں اور میں اس جگہ کے سفید محلوں کو دیکھ رہا ہوں۔'' اور ایسا ہی یمن کے متعلق فرمایا کہ ''اس کی کنجیاں مجھ کو دی گئی ہیں۔''

اور یہ اس حال میں فرمایا جب آپ ایک پتھر کو توڑ رہے تھے۔ آپ نے اس پتھر کو تین ضربوں میں توڑا اور ہر ایک ضرب کے بعد ایک پیشگوئی کی۔ گویا اس پتھر کا توڑنا بطور ایک فال کے تھا کہ یہ سلطنتیں آپ کے صحابہ کے آگے اسی طرح ٹوٹ جائیں گی۔

احادیث کی وہ پیشگوئیاں جو کتب حدیث کی اشاعت کے بعد پوری ہوئیں:

لیکن علاوہ اس کے ایک اور ثبوت بھی یہ احادیث اپنی صداقت کا رکھتی ہیں اور وہ یہ ہے کہ ایسی ہی پیشگوئیاں درمیانی زمانہ کے متعلق بھی پائی جاتی ہیں اور وہ قطعی ثبوت آنحضرت ﷺ کی زبان سے ہونے کا اپنے اندر رکھتی ہیں۔ اس طرح پر کہ حدیث کی اکثر کتابیں جن میں پیشگوئیاں درج ہیں دوسری اور تیسری صدی ہجری میں اکٹھی ہوکر دنیا میں شائع ہوچکی تھیں اور درسوں میں پڑھائی جاتی تھیں۔ اور لاکھوں انسان ان کا مطالعہ کرتے تھے۔ اب انہی کتابوں میں ہم وہ حدیثیں پاتے ہیں جن میں ایسی پیشگوئیاں مذکور ہیں جو صدہا سال بعد پوری ہوئیں۔ اور بسبب اس کے کہ یہ کثرت سے لوگوں کے درمیان شائع ہوچکی تھیں۔ ان کے پورا ہونے پر اہل علم نے ان واقعات کو لکھا اور خدا کا کلام پورا ہونے پر خوشی ظاہر کی۔ اس طرح پر یہ احادیث نہ صرف اپنی صداقت کا ثبوت ہی اپنے اندر رکھتی ہیں بلکہ ان دوسری احادیث کی صداقت پر بھی شاہد ہیں۔ جن میں وہ پیشگوئیاں موجود ہیں جو جمع احادیث سے پہلے زمانہ میں پوری ہوچکی تھیں۔

فتح قسطنطنیہ کی پیشگوئی:

سنن ابوداؤد اور صحاح ستہ کی بعض دوسری کتابوں میں ایسی احادیث موجود ہیں جن میں کھلے کھلے لفظوں میں فتح قسطنطنیہ کی پیشگوئیاں موجود ہیں۔ گویا یہ بیان کیا گیا ہے کہ قسطنطنیہ مسلمانوں کے ہاتھ میں آنے کے بعد پھر نکل جائے گا۔ اب جس وقت ان احادیث کو ان کتابوں میں لکھا گیا اس وقت قسطنطنیہ عیسائیوں کے ہاتھ میں تھا اور مسلمان کی دو یا اڑھائی سو سال کی فتوحات کے باوجود قسطنطنیہ ان کے ہاتھ نہیں آیا تھا اور نہ کوئی قرائن ایسے موجود تھے کہ مسلمان اس شہر کو فتح کریں گے۔ مگر محدثین کو کبھی ان باتوں کا خیال نہ تھا بلکہ وہ صرف یہ دیکھ لیتے تھے کہ حدیث کی صحت ثابت ہے یا نہیں۔ جن احادیث کی صحت ان کے نزدیک پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی تھی وہ انہیں قبول کر لیتے تھے خواہ ان میں ایسی پیشگوئیاں ہوں جو پوری ہو چکی ہوں اور خواہ ایسی ہوں جو ابھی آئندہ زمانہ کے متعلق ہوں۔ اب یہ پیشگوئیاں قسطنطنیہ کے متعلق ابتدا سے مسلمانوں کے درمیان شہرت یافتہ تھیں اور پھر دوسری یا تیسری صدی ہجری میں کتابوں میں لکھی جا کر ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئیں۔ چنانچہ ان کے لکھا جانے کے قریباً پانچ سو سال بعد 1453ء میں قسطنطنیہ مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ ایسے زمانہ میں جبکہ پیشگوئی کے شائع ہونے پر آٹھ سو سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔[1] یہ کس قدر صریح ثبوت ہے۔ نہ صرف اس امر کا کہ یہ احادیث رسول اللہ ﷺ کے منہ سے نکلی ہوئی ہیں بلکہ

1۔ پیشگوئی کا دوسرا حصہ اس زمانہ میں پورا ہوا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی صداقت پر بھی یہ پیشگوئیاں بین گواہ ہیں۔ ایسا ہی انہی کتب یعنی ابوداؤد وغیرہ میں ایسی احادیث موجود ہیں جن میں یہ پیشگوئیاں ہیں کہ مسلمان ترکوں کے ہاتھ سے سخت ہزیمت اٹھائیں گے اور قتل کئے جائیں گے۔ یہ پیشگوئی بھی صدہا سال بعد پوری ہوئی جب ترکوں نے بغداد کو تباہ کیا اور لاکھوں مسلمانوں کا خون بہایا اور اپنی طرف سے خلافت کا خاتمہ کر دیا۔ یہ واقعہ ساتویں صدی ہجری کا ہے جب ان پیشگوئیوں کو کتابوں میں لکھے ہوئے چار سو سال کے قریب گزر چکے تھے۔ چنانچہ جن لوگوں نے ان احادیث کی شرح لکھی ہے انہوں نے ان تمام واقعات کو جو ان پیشگوئیوں کو پورا کرنے والے ہیں پورے بسط سے ان احادیث کے نیچے لکھا ہے۔ اور ان پیشگوئیوں کے پورا ہونے کو آنحضرت ﷺ کے اعجاز کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ ایسا ہی عیسائیوں کا تھوڑے عرصہ کے لیے مسلمانوں پر غالب آ کر بیت المقدس پر قبضہ کر لینا اور مسلمانوں کا پھر دوبارہ ان سے بیت المقدس لے لینا۔ ان سب واقعات کے متعلق ان ہی کتابوں میں پیشگوئیاں لکھی گئیں اور آخر مدت بعد پوری ہو کر لاکھوں انسانوں کے ازدیاد ایمان کا موجب ہوئیں۔

خروج نار کی پیشگوئی:

اسی زمانہ کے متعلق ایک اور مثال میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ صحیح بخاری میں جو بہرحال امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے (جو 256ھ ہجری میں واقع ہوئی) پہلے شائع

ہوچکی تھی۔ بَابُ خُرُوْجِ النَّارِ کے نیچے یہ حدیث ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے درج ہے:

أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: "لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى تَخْرُجَ نَارٌ مِّنْ أَرْضِ الْحِجَازِ، تُضِيءُ أَعْنَاقَ الإِبِلِ بِبُصْرَى".

[صحيح البخاري: 7118]

یعنی ''ضروری ہے کہ قبل از قیامت ارض حجاز سے ایک آگ نکلے جو بصری میں اعناق الابل یعنی ٹیلوں اور پہاڑیوں کو روشن کردے۔''

یہی حدیث صحیح مسلم میں بھی درج ہے۔ اور اس میں یہ کھلی کھلی پیشگوئی ہے کہ ارض حجاز سے کوئی عظیم الشان آگ نکلے گی جس کی روشنی بصرے کی پہاڑیوں تک پہنچے گی۔ یہ پیشگوئی تیرہویں جمادی الآخر 654 ہجری کو پوری ہوئی۔ چنانچہ فتح الباری میں اس آگ کے نکلنے کا حسب ذیل ذکر لکھا ہے:

قَالَ الْقُرْطَبِيُّ فِي التَّذْكِرَةِ: قَدْ خَرَجَتْ نَارٌ بِالْحِجَازِ بِالْمَدِيْنَةِ وَكَانَ بَدْوُهَا زَلْزَلَةً عَظِيْمَةً فِيْ لَيْلَةِ الْأَرْبِعَآءِ بَعْدَ الْعَتَمَةِ الثَّالِثِ مِنْ جَمَادَى الْآخِرَةِ سَنَةَ أَرْبَعٌ وَّخَمْسِيْنَ وَسِتُّمِائَةٍ، وَاسْتَمَرَّتْ إِلٰى ضُحَى النَّهَارِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَسَكَنَتْ، وَظَهَرَتِ النَّارُ بِقُرَيْظَةَ بِطَرَفِ الْحَرَّةِ تُرٰى فِيْ

صُوْرَةِ الْبَلَدِ الْعَظِيْمِ عَلَيْهَا سُوْرٌ مُّحِيْطٌ عَلَيْهِ شَرَارِيْفُ وَأَبْرَاجٌ وَّمَآذِنُ، وَتُرىٰ رِجَالٌ يَّقُوْدُوْنَهَا، لَا تَمُرَّ عَلىٰ جَبَلٍ إِلَّا دَكَّتْهُ وَأَذَابَتْهُ، وَيَخْرُجُ مِنْ مَّجْمُوْعِ ذٰلِكَ مَثَلُ النَّهْرِ أَحْمَرُ وَأَزْرَقُ لَهُ، دَوِيٌّ كَدَوِيِّ الرَّعْدِ، يَأْخُذُ الصُّخُوْرَ بَيْنَ يَدَيْهِ وَيَنْتَهِيْ إِلىٰ مَحْطِ الرَّكْبِ الْعِرَاقِيِّ، وَاجْتَمَعَ مِنْ ذٰلِكَ رَدْمٌ صَارٍ كَالْجَبَلِ الْعَظِيْمِ، فَانْتَهَتِ النَّارُ إِلىٰ قُرْبِ الْمَدِيْنَةِ وَمَعَ ذٰلِكَ فَكَانَ يَأْتِي الْمَدِيْنَةَ نَسِيْمٌ بَارِدٌ، وَشُوْهِدَ لِهٰذِهِ النَّارِ غِلْيَانٌ كَغِلْيَانِ الْبَحْرِ.

وَقَالَ لِيْ بَعْضُ أَصْحَابِنَا: رَأَيْتُهَا صَاعِدَةً فِي الْهَوَآءِ مِنْ نَّحْوِ خَمْسَةِ أَيَّامٍ، وَّسَمِعْتُ أَنَّ النَّارَ رُؤِيَتْ مِن مَّكَّةَ وَمِنْ جِبَالِ بُصْرىٰ. وَقَالَ النَّوَوِيُّ: تَوَاتَرِ الْعِلْمُ بِخُرُوْجِ هٰذِهِ النَّارِ عِنْدَ جَمِيْعِ أَهْلِ الشَّامِ.

[فتح الباري: جلد13، صفحہ 79]

گویا اس آگ کا نکلنا ایک ایسا مشہور واقعہ تھا کہ سب اہل علم نے اس پیشگوئی کے پورا ہونے کو محسوس کیا جو صحیح بخاری اور مسلم میں پائی جاتی ہے۔ مطلب عربی عبارت مذکورہ بالا کا یہ ہے کہ

''قرطبی نے تذکرہ میں اس بات کو بیان کیا ہے کہ حجاز میں ایک

آ گ نکلی اور اس سے پہلے ایک بڑا بھاری زلزلہ آیا اور یہ واقعہ تیسری جمادی الثانی 654ھ ہجری بعد عشا کا ہے اور یہ آ گ برابر جلتی رہی یہاں تک کہ جمعہ کے دن چاشت کے وقت آ کر ٹھہری اور دور سے یہ آ گ ایک بڑے شہر کی طرح نظر آتی تھی۔ جس کے گرد فصیلیں ہوں اور ان پر برج وغیرہ ہوں۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ آدمی اس آ گ کو چلا رہے ہیں۔ جس پہاڑ پر یہ آ گ گزرتی تھی اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی تھی اور پگھلا دیتی تھی۔ اور اس سے ایک نہر نکلتی تھی سرخ اور نیلگوں رنگ کی۔ آواز اس کی ایسی تھی جیسے بادل کے گرجنے کی آواز اور پتھروں کو ساتھ بہائے لیے جاتی تھی۔ اور اس جگہ پر آ کر ٹھہری جو قافلہ عراق کے اترنے کی جگہ ہے اور اس سے ایک روک ایک بڑے پہاڑ کی مانند بن گئی۔ اور آ گ مدینہ کے قرب و جوار تک پہنچ گئی۔ مگر باوجود اس کے مدینہ میں ٹھنڈی ہوا آتی رہی۔ اور اس آ گ میں ایک جوش اور طوفان نظر آتا تھا، جیسا سمندر میں طوفان آتا ہے۔ اور دیکھنے والوں نے بیان کیا کہ قریباً پانچ دن یہ آ گ ہوا میں چڑھی ہوئی دیکھی گئی۔ اور یہ بھی میں نے سنا ہے کہ یہ آ گ مکہ اور بصرے کے پہاڑوں سے نظر آتی تھی۔ اور نووی کہتا ہے کہ کل اہل شام کے نزدیک اس آ گ کے علم کا تواتر پایا جاتا ہے۔''

اب ان پیشگوئیوں کے پورا ہونے پر غور کرو۔ ان واقعات کو ان پیشگوئیوں پر آج ہی نہیں لگایا جاتا بلکہ جس وقت یہ واقعات ظاہر ہوئے اس وقت اہل علم نے ان پیشگوئیوں کے پورا ہونے پر خوشی ظاہر کی۔ کیونکہ یہ پیشگوئیاں کوئی پوشیدہ امر نہ تھیں۔ بلکہ لاکھوں انسانوں میں مشہور اور سینکڑوں کتابوں میں لکھی جا چکی تھیں۔ اور اسی لئے نار حجاز کے نکلنے اور دوسری بعض پیشگوئیوں کو ان شارحین حدیث نے جن کے زمانے سے پہلے یہ واقعات ہو چکے تھے مفصل طور پر اپنی کتابوں میں بیان کیا۔ اس سے بڑھ کر صداقت احادیث کا اور کیا ثبوت طلب کیا جا سکتا ہے۔

ترکوں سے مسلمانوں پر تباہی آنے کی پیشگوئی:

اب ان پیشگوئیوں کی حقیقت پر غور کرو۔ ترکوں کے ہاتھ سے جو مسلمانوں پر تباہی آنے والی تھی۔ اس کی کیسی صریح الفاظ میں مخبر صادق علیہ السلام نے خبر دی تھی۔ نہ صرف ترک کا نام لے کر ہی سمجھایا بلکہ یوں بھی بیان فرمایا:

قَالَ: "لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى تُقَاتِلُوا قَوْمًا نِعَالُهُمُ الشَّعَرُ، وَحَتَّى تُقَاتِلُوا التُّرْكَ صِغَارَ الأَعْيُنِ، ذُلْفَ الأُنُوفِ، كَأَنَّ وُجُوهَهُمُ الْمَجَانُّ الْمُطَرَّقَةُ".

[صحيح البخاري: 2929]

صحابہ کے درمیان یہ پیشگوئی بہت شہرت پا چکی تھی کیونکہ ان کو خبر دی گئی تھی کہ

[اُتْرُکُوا التُّرْکَ مَا تَرَکُوکُمْ]

''جب تک ترک تم کو کچھ نہ کہیں تم بھی انہیں مت چھیڑو۔''

کیونکہ مسلمانوں پر ترکوں کے ہاتھ سے تباہی آنے والی ہے۔ چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ واقعہ لکھا ہے کہ معاویہ بن خدیج کہتا ہے کہ میں معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس تھا تو ان کے پاس ان کے ایک عامل کا خط آیا کہ ترکوں سے اس کا مقابلہ ہوا اور اس نے ترکوں کو بھگا دیا۔ اس پر معاویہ رضی اللہ عنہ بہت غضبناک ہوئے اور اس عامل کو لکھا کہ جب تک میں تم کو نہ لکھوں ان سے جنگ مت کرو۔ کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ترک عربوں کو نکال دیں گے۔ یہاں تک کہ ان کو شیخ (گھاس) کے اگنے کی جگہ تک پہنچا دیں گے۔ یعنی شہروں سے نکال کر جنگلوں میں داخل کر دیں گے۔ جس سے اشارہ عظیم الشان تباہی کی طرف ہے۔ اور معاویہ رضی اللہ عنہ نے لکھا کہ اسی وجہ سے میں ترکوں کے ساتھ جنگ کرنے کو ناپسند کرتا ہوں۔ اور آخر جب مسلمانوں نے مخبر صادق کے حکم أُتْرُکُوا التُّرْکَ کی خلاف ورزی کی اور خوارزم شاہ نے چنگیز خان کے ایلچیوں کو قتل کر ڈالا تو پھر وہ تباہی مسلمانوں پر آئی جس کے سننے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ ایسا ہی طبرانی نے یہ حدیث بیان کی ہے:

[إِنَّ بَنِيْ قَنْطُوْرَا أَوَّلُ مَنْ سَلَبَ أُمَّتِيْ مُلْکَهُمْ]

یعنی ''ترک ہی اول وہ لوگ ہوں گے جو میری امت سے ملک چھین لیں گے۔''

غرض کہ صحابہ کے اندر یہ ایک نہایت ہی شہرت یافتہ امر تھا کہ ترکوں کے ہاتھ سے مسلمانوں پر خطرناک تباہی آئے گی اور یہ پیشگوئیاں صحاح ستہ کی کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں اور ان کے لکھا جانے کے صدہا سال بعد یہ پیشگوئیاں نہایت صفائی اور وضاحت سے پوری ہوئیں۔ الغرض یہ پیشگوئیاں جو اسلام کے درمیانی زمانہ میں پوری ہوئیں مدتوں پہلے احادیث کی کتابوں میں لکھی جا چکی تھیں اور اس طرح پر یہ احادیث کی صداقت پر ایک عظیم الشان گواہ ہیں۔

آخری زمانہ کے متعلق پیشگوئیاں:

مگر ہمارے نبی کریم ﷺ کی پیشگوئیاں اسلام کے ابتدائی یا درمیانی زمانوں تک ہی محدود نہیں رہیں بلکہ اس آخری زمانہ میں بھی وہ اسی صفائی سے آنحضرت ﷺ کے منجانب اللہ ہونے کی شہادت ادا کر رہی ہیں۔ کون مسلمان ہے جو نہیں جانتا کہ اس زمانہ کا نقشہ احادیث میں نہایت صفائی سے کھینچا ہوا موجود ہے؟ دین صلیبی کا اطراف عالم میں پھیل جانا اور اس کا دنیا پر غالب ہو جانا۔ اس کے حامیوں کا مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لیے ہر قسم کے سامان دنیوی کا پیش کرنا۔ اس کے ساتھ عالم میں عیش و عشرت کا ترقی کر جانا اور سیم و زر کی افراط۔ مسلمانوں کا قرآن کو چھوڑ دینا۔ اسلام کا پھر حالت غربت کی طرف عود کر آنا۔ مسلمانوں پر اس قدر فتن کا ہجوم کرنا کہ وہ ایک طرف نکلیں تو دوسری طرف مبتلا ہو جائیں۔ دنیا میں ان قوموں کا پیدا ہو جانا جن کے ساتھ جنگ کرنے کی طاقت کسی کو نہ ہوگی اور ان کا عالم پر محیط ہو جانا۔ آخر عیسائیت کا خود بخود کمزور ہو کر اس

کے عقائد کی غلطی کا دنیا پر ظاہر ہوجانا اور اس طرح پگھل جانا جس طرح نمک پانی میں پگھل جاتا ہے۔ اور دین اسلام کا براہین کے ساتھ غالب آ کر آفتاب صداقت خیر البشر کا مغرب سے طلوع کرنا وغیرہ۔ یہ تمام امور احادیث میں بالصراحت موجود ہیں۔ مگر یہ مضمون اس قدر بسط کو چاہتا ہے کہ اس کے لیے علیحدہ رسالہ کی ضرورت ہے۔ اس لیے میں اسے کسی دوسرے وقت پر چھوڑ کر اصل مضمون کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

تیسرا باب

ضرورتِ حدیث

فہم قرآن میں ہم حدیث کے محتاج ہیں:

سب سے پہلا سوال جو ہمارے سامنے آتا ہے یہ ہے کہ آیا فی الواقع ہمیں حدیث کی کچھ ضرورت ہے؟ جن لوگوں نے اس زمانہ میں انکار حدیث کیا ہے اس کی بڑی وجہ وہ یہی بتاتے ہیں کہ ہمیں حدیث کی کچھ ضرورت نہیں اور نہ قرآن کریم حدیث کا محتاج ہے۔ بلکہ ان لوگوں کی طرف سے جب سوال ہوتا ہے تو اسی رنگ میں ہوتا ہے کہ کیا قرآن کریم کسی اور چیز کا محتاج ہے؟ اس سوال میں درحقیقت ایک مغالطہ ہے اور بعض لوگ گھبرا اٹھتے ہیں کہ آیا فی الواقعہ قرآن شریف کوئی ایسی ناقص چیز ہے کہ وہ کسی دوسرے کا محتاج ہو۔ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ ہم قرآن کریم کو ایک کامل کتاب مانتے ہیں۔ کسی دوسرے کا محتاج اسے قرار دینا اسے ناقص فرض کرنا ہے۔ مغالطہ اس میں یہ ہے کہ فی الواقع قرآن شریف تو کامل ہے اور کسی کا محتاج نہیں۔ مگر ہم اس کے سمجھنے کے لیے بہت سی چیزوں کے محتاج ہیں۔ ہم اس زبان کے محتاج ہیں جس میں قرآن شریف نازل ہوا کہ اس کو جانیں۔ ہم لغت کے محتاج ہیں گو وہ لغت کی کتابیں قرآن شریف کے بعد ہی بنی ہوں۔ ہم صرف ونحو کے محتاج ہیں۔ کیونکہ صرف ونحو نے زبان کے قواعد کو منضبط کر دیا۔ اگر ان چیزوں کو ہم نہیں جانتے تو قرآن شریف کو ہم نہیں جان سکتے۔ اسی

طرح پر قرآن شریف کو سمجھنے کے لیے ہم حدیث کے محتاج ہیں اور یہ ایک موٹی بات ہے کہ جس طرح اپنے اپنے زمانہ میں مفسرین نے اور اہل علم نے لوگوں کو سمجھانے کے لیے قرآن کریم کے متعلق بہت کچھ لکھا حتی کہ اس زمانہ میں مولوی عبداللہ صاحب کو ایک ضخیم ترجمہ۔تفسیر، نماز، زکوٰۃ وغیرہ کے متعلق کتابیں لکھنی پڑیں تا کہ قرآن کریم کی اصل منشا سے لوگوں کو آگاہ کیا جائے۔اسی طرح اور اس سے بہت بڑھ کر نزول قرآن کریم کے وقت یہ ضرورت تھی کہ اس قلب مقدس کا مالک جس پر یہ کلام نازل ہوا اور جو دنیا کے تمام انسانوں سے بڑھ کر اس کے اصل منشا کو سمجھتا تھا، اس منشا سے دوسروں کو آگاہ کرے۔ اس نے اپنے قول سے اور اپنے فعل سے اس اصل منشا کو لوگوں پر ظاہر فرمایا اور اسی کو ہم حدیث کہتے ہیں۔ اور جس طرح وہ لوگ قرآن کریم کے اصل منشا کو سمجھنے کے لیے آنحضرت ﷺ کے قول و فعل کے محتاج تھے اور اس اصل منشا کو مہبط وحی ﷺ سے بڑھ کر کوئی سمجھنے والا نہیں ہوسکتا۔اسی طرح ہم بھی اس اصل منشا کو سمجھنے کے لیے حدیث کے محتاج ہیں۔

خدا قوانین کا محتاج نہیں مگر انسان ہے:

میں اس بات کو دہرانا چاہتا ہوں، انسان دنیا میں بے شمار چیزوں کا محتاج ہے۔ قرآن شریف کے کامل ہونے کے یہ معنی نہیں کہ اب انسانوں کو اور کسی شے کی احتیاج نہیں رہی۔اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو چیزیں انسان کو ملتی ہیں اور وہ جس طرح ملتی ہیں وہ سب امور ایک قانون کے ماتحت ہیں اور اسی قانون کے مطابق وہ چیزیں ملتی ہیں۔خدا

ان قوانین کا محتاج نہیں۔مگر انسان کو ان سب کا محتاج کہیں گے۔ ہدایت جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو ملتی ہے وہ جبریل علیہ السلام لاتے ہیں۔ پس پہلی شاخ تو اس قانون کی یہی ہے۔ پھر حضرت جبریل علیہ السلام اسے ایک قلب صافی پر نازل کرتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ اپنا پیغام پہنچانے کے لیے چن لیتا ہے۔ یہ دوسری شاخ اس قانون کی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر تھا کہ وہ بغیر کسی واسطہ کے براہ راست انسانوں کو اپنا کلام پہنچاتا یا رسول بشر کو ہی بغیر کسی واسطہ کے اپنا کلام پہنچاتا، مگر یہ اس کا قانون ہے۔ اب ہم یوں نہیں کہیں گے کہ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ خدا بھی جبریل کا محتاج ہے یا محمد رسول اللہ ﷺ کا محتاج ہے۔نہیں یہ ایک ضروری واسطہ ہے جو قانون الٰہی کے ماتحت پایا جاتا ہے۔ پھر دوسرا مرحلہ انسانوں تک اس ہدایت کے پہنچنے کا یہ ہے کہ وہ رسول اس کلام کو جو اس پر نازل ہوتا ہے ان پر پڑھ دیتا ہے۔مگر صرف پڑھ دینا بھی کافی نہیں بلکہ ان کو اس کی تعلیم دیتا ہے۔یعنی اس کے اصل منشا سے ان کو آگاہ کرتا ہے۔جیسا کہ فرمایا:

﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾

[الجمعة: 2:62]

پس قانون الٰہی نے یہ ضروری ٹھہرایا کہ ہدایت الٰہی بندوں تک ان سب واسطوں سے پہنچے۔ یعنی اول جبریل رسول بشر کو پہنچائے پھر رسول بشر دوسرے انسانوں کو پہنچائے اور نہ صرف پہنچائے بلکہ اس کی تعلیم دے یعنی اس کے اصل منشا سے ان کو آگاہ کرے۔ یہ ایک زنجیر کی مختلف کڑیاں ہیں۔ان کے باہم تعلق کے بغیر وہ زنجیر نہیں بنتی گو

اپنی جگہ ہر ایک کڑی اس زنجیر کی اعلیٰ درجہ کی مکمل ہو۔ ہم انسان اس زنجیر کی ساری کڑیوں کے یکساں محتاج ہیں۔ ان میں سے ایک کڑی بھی نہ ہو تو ہمارا کام نہیں چل سکتا۔ قرآن شریف پر عامل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کا علم حاصل کریں۔ اس علم کے حاصل کرنے میں ہم تو لغت وصرف ونحو کے بھی محتاج ہیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے فہم کے محتاج کیونکر نہ ہوں؟ مولوی عبداللہ کے پیرو اگر اس بات کے محتاج ہیں کہ مولوی عبداللہ نے اس قرآن کو کس طرح سمجھا؟ تو ہمیں بھی یہ فخر حاصل ہے کہ ہم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے پاک اور سراپا نور فہم کے محتاج ہیں۔ افسوس اس شخص پر جو قرآن شریف کے سمجھنے کے لیے اپنے آپ کو لغت اور صرف ونحو کا محتاج تو سمجھتا ہے مگر اس پاک سرچشمہ کی احتیاج سے اپنی زبان تشنہ کو آزاد کر کے پیاسا مرنا چاہتا ہو، جہاں سے وہ کلام پھوٹ کر نکلا۔ یہ احتیاج سے آزادی نہیں، یہ ہلاکت اور بربادی ہے۔

قرآن کے مفصل ہونے کے باوجود مولوی عبداللہ کی تشریحات:

مگر کہا جاتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی کتاب کے منشا کو بیان کرنے کی ضرورت ہی کوئی نہیں۔ کیونکہ قرآن شریف ﴿تَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ [یوسف:12:111] یعنی ''ہر چیز کی تفصیل۔'' اور فرمایا: ﴿كُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيلًا﴾ [بنی اسرائیل:17:12] ''ہر ایک چیز کو ہم نے اس میں کھول کر بیان کر دیا ہے۔'' اور فرمایا یہ کتاب مفصل ہے [الانعام: 114:7] یعنی اس میں ہر ایک چیز کھول کر بیان کر دی گئی ہے۔ اور اس کو ﴿تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ [النحل:16:89] کہا گیا ہے یعنی ''ہر ایک چیز کو بیان کر دینے والی۔'' پس کسی قسم کی

تشریح یا تفصیل کی حاجت ہی اس نے باقی نہیں چھوڑی۔ ساری تشریحات اور تفصیلات اس کے اندر موجود ہیں۔ ایک شخص حیرت میں رہ جاتا ہے جب ایک طرف مولوی عبداللہ صاحب کے ان دلائل کو پڑھتا ہے اور دوسری طرف ایک حکم ﴿اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ﴾ کی تشریح کے لیے چارسو سے زائد صفحوں کی ایک کتاب میں سے اسے گزرنا پڑتا ہے جس کا نام ہے ''برہان الفرقان علیٰ صلوٰۃ القرآن۔'' ایک طرف مولوی صاحب کے اس قول کو دیکھو کہ ''قرآن مجید میں دین اسلام کی ہر ایک چیز من کل الوجوہ مفصل ومشرح طور پر بیان ہوگئی ہے۔ تو اب وحی خفی یا حدیث کی کیا حاجت رہی۔ بلکہ اس کا ماننا اور دین اسلام میں اس پر عملدرآمد کرنا سراسر کفر، شرک، ظلم، فسق ہے''۔ اور دوسری طرف ایک نماز کی تشریح کے لیے چارسو صفحات کو دیکھو، حالانکہ حدیث کی کسی کتاب میں چارسو صفحات کی نماز کی تشریح کے لیے ضرورت نہیں پڑی، جب حدیث کی عدم احتیاج ثابت کرنی ہو تو قرآن میں ہر چیز من کل الوجوہ مفصل ومشرح طور پر موجود ہو جاتی ہے اور جب نماز کے حکم کی تعمیل کرنے کے لیے راہ بتانی ہو تو چارسو صفحات کی ضرورت پڑتی ہے اور تعجب ہے کہ دین اسلام میں حدیث پر عمل درآمد کرنا تو ''سراسر کفر، شرک، ظلم، فسق ہے۔'' مگر مولوی عبداللہ صاحب کے چارسو صفحات کی تشریح پر عملدرآمد کرنا اور اسے پڑھنا موجب ہدایت ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کا فہم قرآن ہمارے سامنے آئے تو ہم اس سے بیزار ہوں کیونکہ قرآن مفصل ومشرح ہے۔ مگر مولوی عبداللہ صاحب کا فہم وتشریح قرآن عین ہدایت ہے۔ نَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ۔ کہا جائے گا کہ مولوی عبداللہ صاحب قرآن شریف سے ہی استدلال کرتے ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ استدلال کے کیا

معنی؟ جب ہر ایک چیز قرآن شریف میں مفصل ومشرح موجود ہے۔ اور پھر یہ استدلال بھی عجیب ہیں۔

بطور مشتے از نمونہ خروارے دو تین مقام پیش کرتا ہوں تا کہ مولوی عبداللہ صاحب کے اس دعویٰ پر کچھ روشنی پڑے کہ قرآن کریم میں ہر ایک چیز دین اسلام کی من کل الوجوہ مفصل ومشرح ہے۔

قرآن میں بین السجدتین بیٹھنے کا حکم:

دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنا چاہیے۔ یہ بھی قرآن شریف میں مفصل ومشرح موجود ہے مگر اس تفصیل کو دیکھئے:

> ''دو سجدے ہو ہی نہیں سکتے جب تک کہ پہلے سے سر نہ اٹھایا جائے۔ آیت سجدتین میں دوسرا ﴿یَخِرُّوْنَ ...الخ﴾ ظاہر کرتا ہے کہ انبیاء جب دوسرے سجدے میں گرتے تھے تو گرنے سے پہلے سجدہ میں نہیں ہوتے تھے۔۔۔۔ پس پہلے سجدہ سے سر اٹھائے بغیر دوسرا سجدہ نہیں ہوسکتا۔ سر اٹھا کر چار صورتیں ہوسکتی ہیں۔ اول تو یہ کہ زمین سے تھوڑا سا سر اونچا کر کے دوسرے سجدہ میں گر جائے جیسا کہ اکثر جلد باز نمازی کرتے ہیں۔ دوم یہ کہ لیٹ جائے۔ سوم بیٹھ جائے۔ چہارم کھڑا ہو جائے۔ اول و دوم اس لیے

جائز نہیں کہ یہ دونوں خرّ میں داخل ہیں۔ خرّ کے معنی ہیں جھکنا، گرنا۔ پہلی جھکنے میں شامل ہے اور دوسرے گرنے میں۔ پس ان دونوں صورتوں میں انسان حالت خرّ میں ہی ہوتا ہے۔ اور خرّ سے خرّ جائز نہیں۔ بلکہ عدم خرّ سے یعنی ایسی حالت سے جس پر خرّ کا اطلاق نہ ہو سکے اور جو کامل طور پر اس کا ضد و نقیض ہو۔ تیسری اور چوتھی صورت میں خرّ نہیں اور وہ اس کے بالکل ضد و نقیض ہیں۔ اب یہ امر قابل غور ہے کہ ان دونوں میں سے کون سی صورت فرض ہے۔ جاننا چاہئے کہ تیسری صورت یعنی بیٹھنا فرض ہے۔ بدلیل ذیل اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے ﴿اٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ﴾ کہ نزدیکیوں کو ان کا حق دو۔ بیٹھنا سجدہ کا قریبی و نزدیکی ہے۔ اور قیام اس سے دور و بعید ہے۔ سجدے میں جس قدر اندام زمین کے قریب ہوتے ہیں بیٹھنے میں اس سے کم اور کھڑا ہونے میں اس سے بھی کم۔ اس وجہ سے بھی بیٹھنا سجدہ کے نزدیک تر ہے بہ نسبت قیام کے۔۔۔۔ پس قعود ہی اس بات کا مستحق ہے کہ وہ سجدہ کے متصل ہو قیام نہیں''۔ (برہان الفرقان: صفحہ 228-227)

میں نے بہت سی عبارتوں کو چھوڑ دیا ہے اور بطور نمونہ یہ دو سجدوں میں بیٹھنے کا حکم جو بزعم مولوی صاحب قرآن شریف میں مفصل و مشرح موجود ہے۔ اس کا ایک جملہ

بیان کر دیا ہے۔ قارئین کرام یہ نہ سمجھیں کہ مولوی عبداللہ صاحب نے یہ قرآن شریف کی کسی عبارت کا ترجمہ کر دیا ہوگا۔ کیونکہ جو چیز مفصل ومشرح موجود ہو اس کی مزید تفصیل وتشریح کی حاجت نہیں ہونی چاہئے۔ جیسا کہ حدیث کے ردّ کرنے کے لیے مولوی صاحب ضروری سمجھتے ہیں۔ نہیں یہ سارے قیاسات مولوی صاحب کے از خود تراشیدہ ہیں۔ یہ صحیح ہوں یا غلط اس سے اس وقت بحث نہیں۔ ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو۔ صفحہ 282 سے مضمون شروع ہوتا ہے۔

قرآن میں تکبیر کے وقت کان پکڑنے کا حکم:

''تکبیر کہتے وقت کان پکڑنے کے بیان میں۔''

پورے دس صفحوں کے بعد یہ دلیل آتی ہے:

﴿ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ﴾ [الانعام:46]

شاید کسی کو تعجب ہو کہ اس میں کان پکڑنے کا حکم کہاں مفصل ومشرح موجود ہے۔ تو اس کی وجہ مولوی صاحب یہ بتائیں گے کہ تم لوگ قرآن کو غور سے نہیں پڑھتے۔ مولوی صاحب نے چونکہ غور سے پڑھا ہے اس لیے ان کے معنی قبول کرنے ہوں گے۔ وہ معنی یوں ہیں:

''اے پیغمبر جو لوگ کانوں، آنکھوں اور دل کو نماز میں ذلیل وحقیر

نہیں کرتے یعنی کانوں کو نہیں پکڑتے آنکھوں کو ادھر ادھر دیکھنے سے نہیں روکتے اور دل میں خوف ربی نہیں رکھتے ان سے کہہ دو کہ سوچ سمجھ کر بتاؤ کہ اگر اللہ تمہارے کان پکڑے (بڑے کردے) اور تمہاری آنکھیں (مٹادے) اور تمہارے دلوں پر بندش کردے تو سوائے خدا کے تمہارا کوئی بزرگ ہے جو تم کو یہ چیزیں لادے (پس جبکہ کوئی ایسا نہیں تو بہتر ہے تم خود ہی نماز میں اپنے کان پکڑا کرو۔ آنکھوں کو ادھر ادھر دیکھنے سے روکا کرو۔ دل میں خدا کا خوف رکھو تا کہ خدا تمہارے کان نہ پکڑے۔ آنکھیں نہ مٹادے۔ دلوں پر بندش نہ کردے) دیکھ (اے رسول) کیونکر ہم طرح طرح پر تضرع کی آیات بیان کرتے ہیں۔ اس پر بھی یہ لوگ (قرآنی تضرع سے) منہ پھیرے چلے جاتے ہیں۔'' (صفحہ:292)

چونکہ مولوی صاحب کا ایمان یہ ہے کہ قرآن شریف مفصل ومشرح ہے اور اس کی کسی اور تشریح کی حاجت ہی نہیں اس لیے دیکھئے کس قدر احتیاط ترجمہ میں مولوی صاحب نے کی ہے کہ اپنی طرف سے سطروں کی سطریں بڑھادی ہیں۔ اور یہ نماز میں کان پکڑنے کی دلیل ہے۔ اگلے زمانہ میں جو ملا لڑکوں کے کان پکڑوادیا کرتے تھے وہ بھی شاید اسی آیت سے دلیل لیتے ہوں۔ اور اب یہ جھگڑا طے کرنا باقی رہے گا کہ کیوں نماز میں اس طرح کان نہ پکڑے جائیں جس طرح مکتبوں میں طالبعلموں کے پکڑوائے

جاتے تھے؟ کیونکہ پوری ذلت تو اسی طرح ہوتی ہے۔ اگر یہ قرآن شریف ایسی مقدس کتاب کے ساتھ ہنسی نہیں تو اور کیا ہے کہ چونکہ خدا فرماتا ہے کہ اگر وہ چاہے تو تمہاری شنوائی لے جائے۔ اس لیے یہاں یہ مشرح ومفصل حکم موجود ہے کہ اگر تم نماز پڑھتے وقت کان نہ پکڑو گے تو خدا تمہارے کان پکڑے گا اور پھر یہاں تو بصارت کے لے جانے کا بھی ذکر ہے جس کا ترجمہ مولوی صاحب کے نزدیک یہ ہونا چاہئے کہ نماز پڑھتے وقت اپنی آنکھوں میں انگلیاں مارا کرو۔

مگر یہ کان پکڑنے کا مضمون مولوی صاحب کو اس قدر پسند ہے کہ اس پر یہی ایک دلیل کافی نہیں سمجھی۔ بلکہ قرآن شریف سے اور بھی مشرح اور مفصل احکام کان پکڑنے کے متعلق نکالے ہیں۔ چنانچہ دوسری دلیل صفحہ 295 سے شروع ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝﴾ [الکوثر: 2:108] میں بھی کان پکڑنے کا حکم ہے۔ اس مشرح ومفصل حکم کی تشریح میں بھی مولوی صاحب کو تیرہ صفحے لکھنے پڑے ہیں۔ ﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝﴾ کا ترجمہ ''نماز پڑھ اپنے رب کی اور قربانی کر'' کی بجائے مولوی صاحب یوں کرتے ہیں:

> ''تو اپنے رب کی نماز پڑھا کر خاص کر (اپنے وجود کے) اونٹ (کان) کو ذبح (ذلیل وحقیر یعنی پکڑا) کر ہر تکبیر کے ساتھ۔''

مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ نحر تو اونٹ کی قربانی کو کہتے ہیں مگر یہاں اونٹ کی قربانی کا ذکر نہیں بلکہ انسان کے وجود میں جو اونٹ ہے اس کی قربانی مراد ہے۔ اور وہ

وجود کا اونٹ کان ہے۔ کیونکہ جس طرح اونٹ سے بہت نفع پہنچتا ہے کان سے بھی بہت نفع پہنچتا ہے اور اس کے ذبح کرنے سے مراد اس کا ذلیل کرنا ہے اور ذلیل کرنے سے مراد اس کو پکڑنا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ نماز میں ہر تکبیر کے ساتھ کان پکڑنے کا حکم مشرح ومفصل قرآن شریف میں موجود ہے۔

قرآن سے نماز کی رکعتوں کی تعداد:

نماز کی رکعتیں معلوم کرنے کے لیے بھی مولوی صاحب کو بہت کچھ محنت کرنی پڑی ہے اور یہ مسئلہ پورے 45 صفحوں کی تشریح کے بعد حل ہوا۔ حالانکہ ہر ایک حکم دین اسلام کا قرآن شریف میں ایسا مشرح ومفصل موجود تھا کہ دوسری کتاب کو ہاتھ لگانا خدا کی نافرمانی میں داخل تھا۔ مگر مولوی صاحب نے اپنے ہم خیالوں کو اگر حدیث کو ہاتھ لگانے سے بچایا جہاں چند سطروں میں رکعتوں کا مضمون آجاتا ہے تو پچاس صفحے رکیک تاویلوں کے ان کے سپرد کیے کہ ان کو پڑھ کر خدا کے حکم کی نافرمانی کیا کریں۔ کیونکہ جو چیز قرآن شریف میں مشرح ومفصل موجود تھی مولوی صاحب اسی کی تشریح وتفصیل کرنے بیٹھ گئے۔ رکعتوں کا کسی نماز میں دو، کسی میں تین، کسی میں چار ہونا تو ذیل کی آیات میں مشرح ومفصل موجود ہے۔ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ﴾ [فاطر:1:35] اس کا لفظی ترجمہ صرف اس قدر ہے ''سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور فرشتوں کو رسول بناتا ہے دو تین اور چار جناحوں والے جو چاہتا

ہے پیدائش میں بڑھاتا ہے''۔مگر اس کے معنے مولوی عبداللہ صاحب یوں کرتے ہیں:

''(پڑھا کرو) اے ہر ایک اہل آسمان و اہل زمین الحمد (یعنی پانچوں نمازیں) واسطے راضی کرنے اللہ کے کیونکہ وہ فطرت پاک پیدا کرنے والا ہے۔تم تمام آسمان والو! (فرشتوں کی) اور تم تمام روئے زمین والوں (جن وانس) کی (چونکہ تم فِطْرَتَ اللّٰہِ میں تغیر وتبدل کرتے رہتے ہو اس لیے نمازیں پڑھتے رہا کرو تا کہ جبر نقصان ہوتا رہے اور اللہ وہ ہے) جو کرنے والا ہے اپنے فرشتوں کو رسول تمہاری طرف جو لانے والے تمہاری صلوٰتوں یعنی رکعتوں کے ہیں جن کا حق یہ ہے کہ وہ دو دو بار ادا کی جاویں اور تین تین بار اور چار چار بار مطابق تعلیم کتاب اللہ (یعنی جس وقت کی اللہ تعالیٰ نے دو رکعتیں مقرر کر دیں ہیں اس کی دو پڑھو جس کی تین فرمائی ہیں اس کی تین ادا کرو جس کی چار معین کی ہیں اس کی چار پڑھو) اس سے اللہ جبر نقصان کرنا چاہتا ہے۔تمہاری تبدیل شدہ فطرت کا جس قدر انسان چاہتا ہے۔(یعنی جس قدر نماز میں توجہ وخشوع کرتا ہے)۔''(صفحہ:341)

اس مشرح ومفصل حکم کی اس مفصل ومشرح تشریح پر کچھ اور بڑھانا لاحاصل ہے۔ ہاں اس سوال کا خوب جواب دیا ہے کہ کس کس نماز کے لیے دو رکعت ہیں کس کے لیے

تین کس کے لیے چار؟ اس کی تشریح وتفصیل قرآن کریم میں یوں بیان ہوئی ہے کہ نماز قصر بحالت اشد خوف امام کی دو رکعت ثابت ہوتی ہے۔ جیسا کہ ﴿فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۚ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ [النساء: 101:4] سے معلوم ہوتا ہے اور قیاس یہ چاہتا ہے کہ مقتدی بھی دو رکعت ہی ادا کریں گو قرآن مجید میں باوجود مشرح ومفصل ہونے کے مقتدیوں کی ایک ہی رکعت کا ذکر ہے اور دوسری رکعت کا ذکر نہیں ہے اور قصر چونکہ نصف ہوتا ہے اس لیے پوری نماز بحالت اشد امن چار رکعت ہوئی۔ اور اشد امن دن کے تین وقتوں میں ہوتا ہے یعنی ظہر عصر اور عشا اور صبح کا وقت اشد خوف کا ہوتا ہے۔ کیونکہ ''صبح کے وقت نیند کے ہاتھوں انسان بالکل بے بس و بے اختیار ولاچار ہوتا ہے''۔ پس اس وقت اشد خوف والی نماز یعنی دو رکعت پڑھنی چاہئے۔ اور ''شام کے وقت بھی انسان کاروبار مویشی کے بکھیڑوں میں سرگردان حیران و پریشان ہوتا ہے اور سخت مجبور ہوتا ہے۔۔۔ پس یہ درمیانہ وقت ہے کہ نہ تو انسان اس وقت بالکل مردہ و بے اختیار ہوتا ہے۔ مثل صبح کے اور نہ ظہر کی طرح کامل فراغت واطمینان ہوتا ہے''۔ پس اس کی نماز بھی درمیانہ ہوئی یعنی تین رکعت۔ اگر نبی کریم ﷺ کا عمل جو حدیث میں محفوظ ہے یہ بتائے کہ نماز صبح دو رکعت اور نماز مغرب تین رکعت اور ظہر، عصر، عشاء چار چار رکعت ہیں تو یہ قابل قبول نہیں۔ بلکہ اس بنا پر دو تین چار رکعت نماز پڑھنا شرک، کفر، فسق، ظلم ہے۔ خدا کے حکم کی نافرمانی ہے۔ لیکن جب مولوی عبداللہ صاحب مذکورہ بالا وجہ بیان کردیں تو پھر یہ عین حکم الٰہی ہے۔

نئے اہل قرآن اوران کی نماز:

مولوی عبداللہ صاحب کے آج کل کے بعض پیروان تشریحات سے تنگ آ کر یہ کہہ اٹھتے ہیں کہ مولوی عبداللہ صاحب نے حدیث کی عینک سے قرآن کو پڑھا ہے۔مگر جوشخص بھی اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ کے حکم کومنجانب اللہ مان کراس کی تعمیل کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے وہ بغیر حدیث کی عینک کے قرآن کونہیں پڑھ سکتا۔خواہ وہ ایک سچے مسلم کی طرح آنحضرت ﷺ کے قول وفعل کو بسروچشم قبول کرے۔اورخواہ مولوی عبداللہ کی طرح ان چیزوں کوپس پشت پھینکتا ہوا آخرکئی سوصفحات کی تاویل رکیک سے اسی کے مطابق نماز بنالے۔ہاں اب اس فرقہ میں وہ اباحتی گروہ پیدا ہوتا جارہا ہے جوکسی چیز کی بھی پروا نہیں کرتا۔اورمولوی عبداللہ صاحب نے توصرف اذکار نماز میں کچھ تغیر کیا تھا۔ان لوگوں نے پانچ نمازوں کی تین نمازیں بھی بنائیں ہیں۔اور ہرنماز صرف دورکعت رکھی ہے اور ہر رکعت میں صرف ایک سجدہ رکھا ہے اور رکوع قعدہ وغیرہ کو بالکل نکال دیا ہے۔کیونکہ حدیث تو مولوی صاحب نے ان سے چھڑادی اورمولوی صاحب کی رکیک تاویلیں ان کا دماغ قبول نہیں کرتا۔مگرحدیث کی عینک کو پورے طور پرابھی انہوں نے بھی اتارکرنہیں پھینکا۔کیونکہ سورہ فاتحہ کونماز میں پڑھتے ہیں حالانکہ قرآن شریف میں کہیں حکم نہیں کہ سورہ فاتحہ نماز میں پڑھی جائے۔﴿وَلَقَدۡ اٰتَیۡنٰکَ سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ﴾ [الحجر:15:87] میں اول ﴿سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ﴾ سے فاتحہ مراد لینا خلاف تشریح وتفصیل ہے۔پھروہاں یہ نہیں لکھا کہ اس کونماز میں پڑھا کرو۔پھرنماز میں قرآن پڑھنے کا حکم

بھی کہیں نہیں۔﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ﴾[المزمل:20:73]اور﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ﴾[المزمل:20:73]کے ساتھ فِي الصَّلٰوةِ نہیں۔پھر تین وقت نماز پڑھنے کا بھی ذکر کہیں نہیں۔ بلکہ ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ﴾ [بنی اِسرائیل: 78:17] کے ظاہر معنی تو صرف یہی ہیں کہ آفتاب کے زوال سے لے کر رات کی تاریکی تک نماز پڑھتے رہو۔مشرح ومفصل حکم تین وقت نماز پڑھنے کا کہیں نہیں۔پھر خوف کے وقت قصر کے متعلق تو یہ فرمایا کہ ایک گروہ امام کے پیچھے ایک رکعت پڑھ جائے اور دوسرا گروہ دوسری رکعت پڑھ جائے۔اب یہ کون بتائے کہ یہ قصر نماز امام کی ہے یا مقتدیوں کی؟ مولوی عبداللہ تو کہتے ہیں کہ قصر امام نے کی ہے۔پس اصل نماز چار رکعت ہوئی۔ ان کے نئے ہم خیال کہتے ہیں قصر مقتدیوں نے کی ہے اصل نماز دو رکعت ہے۔اب ظاہر ہے کہ قرآن شریف کا حکم تو ایک ہی ہوگا یا تو مولوی عبداللہ صاحب خلاف قرآن کرتے رہے یا ان کے نئے پیرو خلاف قرآن کر رہے ہیں۔ان دونوں کے درمیان فیصلہ کون کرے گا؟ مشرح ومفصل حکم موجود ہونے کے باوجود خود استاد اور شاگرد میں اس قدر اختلاف ہے۔دوسروں کو الگ رکھو اور ابھی معلوم نہیں کہ آئندہ کیا اختلاف پیدا ہوں گے؟

مولوی صاحب اور ان کے شاگردوں میں اختلاف باوجود یکہ قرآن مفصل ہے:

مولوی عبداللہ صاحب کو قرآن شریف کے مشرح ومفصل احکام میں دو اور تین اور

چار رکعتیں نظر آتی ہیں۔ان کے پیروؤں کو دو نظر آتی ہیں۔مولوی عبداللہ صاحب کو نماز شروع کرتے وقت کان پکڑنے کا حکم مشرح ومفصل نظر آتا ہے ان کے پیروؤں کو نظر نہیں آتا۔مولوی عبداللہ صاحب کو پانچ نمازیں نظر آتی ہیں ان کے پیروؤں کو صرف تین دکھائی دیتی ہیں۔مولوی صاحب کو دو سجدوں، رکوع، جلسہ وقعدہ کا حکم نظر آتا ہے۔ شاگردوں کو یہ باتیں دکھائی نہیں دیتیں۔اب فرمایئے ان میں فیصلہ کون کرے؟ معلوم ہوا ان سب کا اعتقاد یہ ہے کہ باوجود مشرح ومفصل ہونے کے کچھ مزید تشریح وتفصیل کی ضرورت باقی ہے جس میں اختلاف ہو رہا ہے۔اور وہ اختلاف ایسا ہے کہ اس کا فیصلہ کرنے والا اب کوئی نہیں۔استاد کچھ کہتا رہا شاگرد کچھ کہتے ہیں۔دوسرے لوگ ان میں سے کس کا تتبع کریں؟ اور ابھی جو آئندہ اور بھی ذہین طبیعتیں سب قیدوں سے آزاد پیدا ہوں گی وہ ان نئے شاگردوں کی بھی وہی گت بنائیں گی جو انہوں نے استاد کی بنائی ہے۔پس باوجود مشرح ومفصل ہونے کے اب تک یہ پتہ فی الحقیقت نہ لگا کہ جس الصَّلٰوۃَ کا حکم اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ میں قرآن شریف نے دیا ہے وہ کیا ہے؟

عالم اسلامی کا ارکان نماز پر اتفاق:

پس جب خود اہل قرآن کے نزدیک ان لوگوں کے نزدیک بھی جو دین اسلام کے کل احکام کو قرآن کریم کے اندر مشرح ومفصل مانتے ہیں۔قرآن شریف کی عبارات کی مزید تشریح وتفصیل بکار ہے تو اس تشریح وتفصیل کی ضرورت محمد رسول اللہ ﷺ کے وقت میں بھی تھی۔آپ نے یہ تشریح وتفصیل اپنے قول اور اپنے عمل سے کر کے دکھادی۔

اسی کو ہم حدیث کہتے ہیں۔ مولوی عبداللہ اور ان کے شاگردوں میں جو اختلاف نماز کے اوقات، نماز کی رکعات، نماز کے ارکان میں ہوا ہے حالانکہ قرآن شریف کے احکام میں سے یہ صرف ایک حکم ہے۔ اس کا بروئے اصول اہل قرآن اب تا قیامت کوئی فیصلہ نہیں ہوسکتا اور یہ ابھی چند سو آدمیوں کی حالت ہے جو پندرہ بیس سال کے اندر اندر پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن قربان جائیں محمد رسول اللہ ﷺ کے کہ ایسی تشریح و تفصیل کی جس پر مشرق سے لے کر مغرب تک تیرہ سو سال کے اندر تمام مسلمانوں کا اتفاق موجود ہے۔ مشرق بعید میں ملک چین میں جا کر دیکھ لو یا سمندر کے اندر علیحدہ علیحدہ جزائر میں دیکھ لو۔ ہندوستان کے میدانوں یا پہاڑوں میں دیکھ لو۔ ترکستان، افغانستان، بلوچستان میں دیکھ لو۔ روس اور روم میں دیکھ لو۔ عرب اور افریقہ کے ریگستانوں میں دیکھ لو۔ یورپ کی اسلامی آبادیوں میں دیکھ لو۔ وہی پانچ نمازیں، وہی ان کے اوقات، وہی ان کی رکعات، وہی ان کے ارکان۔ بیسیوں فرقے ہیں لیکن نمازوں کے اوقات رکعات اور ارکان میں کوئی اختلاف نہیں اور نہ تیرہ سو سال میں کبھی ہوا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ آخر رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ نزول قرآن کے زمانہ میں کوئی نماز پڑھتے تھے۔ اور یہ بھی مسلم امر ہے کہ صحابہ کے زمانہ میں باہم اختلافات بھی شروع ہو گئے تھے۔ پس اگر وہ نماز جو تمام اسلامی دنیا اس وقت پڑھتی تھی رسول اللہ ﷺ کی نماز نہیں تو دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو خود صحابہ نے ہی اس نماز کو رسول اللہ ﷺ کی وفات کے ساتھ ہی تبدیل کر لیا۔ مگر اس کو اہل قرآن بھی نہیں مانتے بلکہ مولوی عبداللہ صاحب تو سینکڑوں سال تک اصل حالت پر نماز کو مانتے ہیں اور سینکڑوں سال کے بعد احادیث کا بننا مانتے ہیں۔ تو

دوسری صورت یہ ہے کہ نماز اس وقت تبدیل ہوئی جب اسلام میں مختلف فرقے پیدا ہو چکے تھے۔ اور مسلمان نہ صرف عرب، ایران، ترکستان، شام، مصر میں پھیل چکے تھے بلکہ ہندوستان، چین تک بھی پہنچ چکے تھے۔ اب وہ کون سی طاقت تھی جس نے تمام فرقوں کو یک مرتبہ اس نماز کے چھوڑنے پر ایسا مجبور کر دیا کہ وہ اپنے سارے اختلافات کے باوجود اتنا نہیں کرتے کہ کوئی فرقہ یا کسی فرقہ کا کوئی آدمی ہی اصل نماز کو محفوظ رکھے؟ اور وہ کون سے ذرائع تھے جن کو استعمال میں لا کر ہزار ہا میلوں اور الگ الگ ملکوں میں پھیلے ہوئے مسلمانوں سے ایک ہی وقت اصل نماز چھڑا کر ایک نئی نماز ان میں مروج کر دی گئی؟ اور اس کا کرنے والا کون تھا؟ خیالات کی تبدیلی تو آہستہ آہستہ دور تک پہنچ جاتی اور اپنا اثر پھیلا دیتی ہے۔ کیونکہ خیالات کے مالک تھوڑے لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن ایسا عمل جو ادنیٰ سے اعلیٰ تک میں پھیلا ہوا ہو اور جو مشرق سے مغرب تک سب لوگوں میں یکساں پایا جاتا ہو اور جس کا اظہار ہر روز لازماً پانچ مرتبہ ہوتا ہو۔ اس میں فوراً تبدیلی ہونی تو ممکن نہیں۔ اور تدریجاً تبدیلی پیدا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی کبھی مخالفت بھی کہیں ہوئی ہو۔ بالخصوص فرقہائے مخالف ضرور تھا کہ اس میں ایک دوسرے کے خلاف پہلو لیتے۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ ہمیں ادنیٰ سے ادنیٰ نشان بھی اس مزعومہ اصلی نماز کا نہیں ملتا۔ مولوی عبداللہ صاحب نے تو یہ احتیاط کی ہے کہ اسی مشکل کو دیکھ کر نماز کے اوقات اس کی رکعات اس کے ارکان کو وہی رکھا ہے مگر ان کے ہم خیالوں نے بالکل ہی نئی نماز تجویز کرتے وقت ادنیٰ فکر سے بھی کام نہیں لیا اور اتنا بھی نہیں سوچا کہ جو بات وہ پیش کرتے ہیں اسے کوئی عقل انسانی قبول نہیں کر سکتی کہ

مسلمانوں کے کل فرقے مشرق ومغرب میں پھیلے ہوئے سب کے سب ایک ہی وقت میں اصل نماز کو چھوڑ کر ایک نئی نماز کے بنانے اور اس کے مطابق احادیث وضع کرنے پر متفق ہو گئے ہوں۔ جو بات محال عقلی ہے اس پر دلائل دینے کے کیا معنی؟

فروعی اختلافات:

اور اگر یہ کہا جائے کہ حدیث کو مان کر بھی تو نمازوں میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ وہ اختلاف اوقات میں نہیں، رکعات میں نہیں، ارکان میں نہیں۔ باقی رہیں چھوٹی چھوٹی باتیں ہاتھ سینے کے اوپر باندھے جائیں یا نیچے۔ رفع یدین کیا جائے یا نہیں۔ آمین بلند آواز سے کہی جائے یا ہلکی آواز سے ان میں اختلاف ہونا ایک بالکل معمولی بات ہے اور اس کی اصل وجہ بھی یہی معلوم ہوتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان معاملات میں وسعت رکھی ہے۔ کبھی ایک طرح عمل کر لیا ہے، کبھی دوسری طرح۔ لیکن جس طرح تمام مسلمانوں کے پاس ایک ہی قرآن ہے، تمام مسجدیں جہاں کہیں ہوں ایک ہی رخ یعنی قبلہ رخ بنی ہوئی ہیں، اسی طرح نماز بھی تمام مسلمانوں کی ایک ہے۔ اس کے وہی اوقات ہیں، وہی رکعات ہیں، وہی ارکان ہیں اور یہ اس بات کا کہ یہی نماز آنحضرت ﷺ کی تھی، ایسا عظیم الشان تاریخی ثبوت ہے کہ جو شخص اس کو رد کرتا ہے وہ دنیا کے کسی تاریخی امر کو قبول نہیں کر سکتا۔

نبی کے دو الگ الگ کام۔ آیات کا پڑھنا اور ان کی تعلیم دینا:

اس ساری بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن کریم باوجود ﴿وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ ہونے کے مزید تشریح و تفصیل چاہتا ہے۔ اسی کے احکام کی تشریح و تفصیل ہی نبی کریم ﷺ نے فرمائی ہے۔ حکم ہوا اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ آپ نے نماز پڑھ کر دکھادی کہ صلوٰۃ سے یہ مراد ہے۔ پس اگر ہم لغت کے محتاج ہیں تو اس سے بہت بڑھ کر آنحضرت ﷺ کی حدیث کے محتاج ہیں اور اگر ہم آنحضرت ﷺ کی حدیث کے محتاج نہ ہوں گے تو مولوی عبداللہ صاحب کی تشریحات کے محتاج ہوں گے۔ اس کے محتاج نہ ہوں گے تو ان کے کسی پیرو کی تشریحات کے محتاج ہوں گے۔ اب یہ ایک شخص کا اختیار ہے کہ وہ چاہے تو اس تشریح کو قبول کرے جو مولوی عبداللہ اور ان کے ہم خیال پیش کرتے ہیں اور چاہے اس تشریح کو قبول کرے جو خود مہبط وحی ﷺ نے پیش کی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گو اہل قرآن بھی تشریح کرنے پر مجبور ہوں۔ مگر کیا خود قرآن شریف بھی اپنی کسی تشریح کی حاجت بتاتا ہے۔ میں نے شروع میں کہا تھا کہ قرآن کریم رسول کے دو کام بتاتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ اس کی آیات دوسرے کو پڑھ کر سنادے۔ دوسرا یہ کہ وہ ان کو کتاب کی تعلیم دے۔ ﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ [الجمعۃ:2:62] مولوی صاحب نے یہ خوب ہتھیار ایجاد کیا ہے کہ ہر جگہ واؤ عاطفہ کو تفسیری قرار دے لیا اور چھٹی ہوئی۔ لیکن یہاں یہ ہتھیار کام نہیں دے سکتا۔ اس لیے کہ تلاوت آیات یعنی وحی الٰہی پڑھ کر سنادینے کے

بعد دوسرا جملہ ہے ﴿وَيُزَكِّيهِمْ﴾ ''اور ان کا تزکیہ کرتا ہے۔'' یعنی ہر ایک قسم کی آلائش سے ان کو پاک کرتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ تلاوت آیات اور تزکیہ الگ کام نہیں۔ یعنی یوں نہیں کہہ سکتے کہ ان پر آیات پڑھتا ہے۔ یعنی ان کا تزکیہ کرتا ہے۔ یہ دو الگ الگ کام ہیں۔ تلاوت آیات اور تزکیہ ایک شے نہیں۔ پھر اس کے بعد تیسرا کام لکھا ہے کہ ''ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔'' جس طرح تلاوت آیات اور تزکیہ ہم معنی نہیں اسی طرح تزکیہ اور تعلیم کتاب وحکمت ہم معنی نہیں۔ یہ الفاظ اور مفہوم دونوں کے ساتھ ہنسی ہوگی کہ ہم کہیں کہ معنی یوں ہیں کہ رسول ان پر آیات پڑھتا ہے یعنی ان کا تزکیہ کرتا ہے یعنی کتاب وحکمت کی ان کو تعلیم دیتا ہے۔ یہ خوب تفسیر ہے۔ سیدھے سادے الفاظ تلاوت آیات کی تفسیر کی کہ اس سے مراد تزکیہ ہے اور پھر تزکیہ کی تفسیر کی کہ اس سے مراد تعلیم کتاب وحکمت ہے۔ بھلا ان الٹی تفسیروں سے حاصل کیا؟ قرآن کریم جیسے پاک اور پُرمعنی کلام سے یہ تمسخر ہے کہ تلاوت آیات کی تفسیر تزکیہ سے کی جائے اور تزکیہ کی تفسیر تعلیم سے کی جائے۔

تعلیم کا مفہوم:

الغرض یہ صاف بات ہے کہ یہاں تین کام رسول اللہ ﷺ کے بیان فرمائے ہیں۔ ایک آیات قرآنی کا پڑھ کر سنا دینا۔ دوسرے اپنے پیروؤں کو آلائشوں سے پاک کرنا جو آپ اپنی قوت قدسی اور دعاؤں اور عقد ہمت اور نمونہ سے کرتے تھے۔ اور تیسرا کام تعلیم کتاب وحکمت ہے۔ گویا تعلیم محض تلاوت سے الگ ہے۔ اب تعلیم کتاب و

حکمت سے مراد یہ تو ہو نہیں سکتی کہ ان کو قرآن شریف حفظ کرا دیں۔ حفظ کرنا ان کا کام تھا۔ آپ کا کام ان پر آیات کا پڑھ دینا تھا۔ حفظ کرانا کوئی کام نہیں۔ آپ کا کام تلاوت آیات تھا اور صحابہ آپ کو پڑھتا سن کر حفظ کر لیتے تھے۔ علاوہ ازیں استاد جب شاگرد کو تعلیم دیتا ہے تو وہ صرف کتاب پڑھ کر نہیں سناتا۔ بلکہ اس کے اصل مطالب اور منشا سے اسے آگاہ کرتا ہے۔ پڑھ کر سنا دینا اور تعلیم دینا دو الگ الگ باتیں ہیں۔ چنانچہ مولوی عبداللہ صاحب نے خود بار بار اپنی کتابوں میں اس بات پر زور دیا ہے کہ قرآن کریم میں نبی ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ ﴿ وَ اَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ﴾ میں تم پر قرآن کو پڑھ دوں۔ لیکن ﴿ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ﴾ کے یہ معنی نہیں کہ اس کے سوا دوسرا کوئی کام نہ کرو۔ قرآن کی تلاوت بھی بے شک ایک کام ہے مگر دوسرا کام تعلیم بھی ہے جس کو الگ بیان فرمایا اور تعلیم دینے کے یہی معنی ہیں کہ جو باتیں اس میں قابل تشریح ہیں آپ ان کی تشریح فرما دیں۔ ورنہ تلاوت قرآن کے علاوہ تعلیم قرآن کو بیان کرنا بے سود تھا اور یہ آیت جس میں تلاوت آیات کے ساتھ تعلیم کتاب کو الگ کام بیان کیا گیا ہے قرآن شریف میں چار مختلف جگہوں پر آتی ہیں۔

قرآن کا پڑھنا اور اس کا بیان دونوں کام اللہ نے اپنے بتائے ہیں:

گو آیت مذکورہ بالا اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ قرآن شریف نے تعلیم کو تلاوت سے الگ بیان کر کے اس کے معانی کی تشریح کو نبی کریم ﷺ کا ایک کام قرار دیا ہے مگر اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ ایک اور موقعہ پر قرآن کریم کی

تشریح کی ضرورت بتائی ہے۔فرمایا:

﴿اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿۱۸﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿۱۹﴾﴾[القیامۃ:75:17-19]

''بے شک ہم پر ہے اس کا جمع کرنا اور اس کا پڑھ دینا۔ پھر جب ہم اس کو پڑھ دیں تو تم اس کے پڑھنے کی پیروی کرو۔ پھر ہم پر ہے اس کی وضاحت کر دینا۔''

اب اس جگہ اللہ تعالیٰ نے تین باتیں بیان فرمائیں یعنی ایک جمع قرآن، دوسرے اس کا پڑھ دینا، تیسرے اس کا بیان۔ بیان کیا چیز ہے؟ مفردات میں ہے:

[وَسُمِّيَ الْكَلَامُ بَيَانًا لِّكَشْفِهٖ عَنِ الْمَعْنٰى الْمَقْصُوْدِ لِاِظْهَارِهٖ.]

یعنی'' کلام کو بیان کہا جاتا ہے اس لیے کہ وہ اس معنی کو واضح کرتی ہے جس کا ظاہر کرنا مقصود ہے۔''

اس معنی میں خود قرآن شریف کو بیان کہا ہے:﴿هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ﴾[آل عمران: 138:3] یعنی یہ لوگوں کے لیے معنی مقصود کو ظاہر کرنے والی چیز ہے۔لیکن ظاہر ہے کہ یہ معنی﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ میں مراد نہیں ہو سکتے کیونکہ ﴿بَيَانَهٗ﴾میں ضمیر خود قرآن شریف کی طرف ہے۔ پس یہاں مراد قرآن کا بیان ہے۔مضاف اور مضاف الیہ دو الگ الگ چیزیں ہیں جس طرح قرآن اور اس کا جمع کرنا دو باتیں ہیں اور قرآن اور

اس کا پڑھ دینا دو باتیں۔ اسی طرح قرآن اور اس کا بیان دو باتیں ہیں۔ اس لیے یہاں وہ دوسرے معنی مقصود ہیں جن کو امام راغب نے مفردات میں بیان کیا ہے۔

بیان کا مفہوم:

[وَسُمِّيَ مَا يُشْرَحُ بِهِ الْمُجْمَلُ وَالْمُبْهَمُ مِنَ الْكَلَامِ بَيَانًا، نَحْوَ قَوْلِهِ: ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾]

یعنی جو چیز اجمال اور ابہام والی بات کی تشریح کرتی ہے اسے بیان کہا جاتا ہے۔

اور وجہ اس کی بھی وہی ہے کہ وہ معنی مقصود کو کھول دیتی ہے۔ اس معنی کی مثال خود امام راغب نے بھی یہی آیت زیر بحث دی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہاں تین کام اپنی طرف منسوب فرمائے ہیں؛ ① قرآن کا جمع کرنا۔ ② قرآن کا پڑھ دینا۔ ③ قرآن کی تشریح یا وضاحت کرنا۔ یہی تشریح احادیث میں پائی جاتی ہے۔ رہا یہ کہ یہ کام تو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ سو یہ اسی طرح ہے جس طرح پڑھنا بھی اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کے ذریعہ سے اپنے نبی پر پڑھا تو نبی نے لوگوں پر پڑھا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس کے معنی کی وضاحت نبی پر ظاہر فرمائی تو نبی نے دوسروں پر ظاہر فرمائی۔ ایسا ہی اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف کو نبی کے سینہ میں جمع کیا تو نبی نے دوسروں کے سینہ میں اسے جمع کیا۔ بہرحال تین کام الگ الگ بیان کئے اور یہاں واؤ عاطفہ بھی پہلے دو میں ہے۔ لیکن ﴿اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ سے پہلے واؤ نہیں کہ

اسے تفسیری کہہ کر پیچھا چھڑا لیا جائے۔ بلکہ ثُمَّ سے اسے الگ کر کے ظاہر کر دیا کہ وہ الگ کام ہے۔

قرآن کریم مفصل ہے مگر مزید تشریح کی ضرورت ہے:

اوپر کی عبارت میں امام راغب نے بَیَانَ کے معنی کرنے میں لفظ اجمال وابہام کو استعمال کیا ہے اور یہ شاید بعض لوگوں کو ناگوار گزرے۔ کیونکہ قرآن کریم اپنے آپ کو مفصل کہتا ہے اور ﴿وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ کہتا ہے۔ سو یاد رکھنا چاہئے ایسے الفاظ نسبتی ہوتے ہیں۔ مولوی عبداللہ صاحب نے قرآن شریف کے اندر مجاز اور کنایہ اس قدر مانا ہے کہ وہ اپنا سارا کام ہی اس سے نکالتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ مجاز و کنایہ اجمال میں سے ہی ہیں۔ اور سب اہل قرآن اپنی اپنی تشریح الگ الگ کرتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ تشریح اور وضاحت کے اصول کو باوجود قرآن شریف کو مفصل ماننے کے انہوں نے بھی مانا ہے۔ یوں تو قرآن شریف نے توریت کے متعلق بھی فرمایا ہے: ﴿ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً﴾ [الانعام:6:154] جہاں حضرت موسیٰ کی کتاب یعنی تورات کو کل چیزوں کی تفصیل فرمایا ہے۔ اور ایسا ہی دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَكَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ [الاعراف:7:145] یہاں بھی توریت میں ہر شے کی تفصیل بیان فرمائی۔ پھر باوجود توریت کی موجودگی کے حضرت داؤد علیہ السلام کو زبور دی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل دی۔ آخر وہ بھی بلا ضرورت نہ تھیں۔ حالانکہ اگر ﴿كُلِّ شَيْءٍ﴾ کی

تفصیل توریت میں موجود تھی تو انجیل وزبور کا دینا بالکل فضول تھا۔ اہل قرآن حدیث کو اس لیے فضول ٹھہراتے ہیں کہ قرآن میں ہر شے کی تفصیل ہے۔ لیکن اگر اس دلیل کو صحیح مانا جائے تو توریت میں تو ہر شے کی تفصیل تھی۔ پھر انبیائے بنی اسرائیل کو کتابیں کیوں دی گئیں۔ وہ تمام کتابیں جن میں حضرت داؤد علیہ السلام کی زبور اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل بھی ہیں اس دلیل کے رو سے نعوذ باللہ فضول ٹھہریں۔ اسی طرح ایک طرف توریت کو ﴿وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ کہا اور دوسری جگہ قرآن کریم کو اس کی اور سب کتب منزلہ کی تفصیل ٹھہرایا ہے:

﴿وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾

[یونس: 37:10]

''یہ قرآن ایسا نہیں کہ اللہ کے بھیجے سوا افترا کرلیا گیا ہے۔ لیکن اس کی تصدیق ہے جو اس سے پہلے موجود ہے اور کتاب کی تفصیل ہے اس میں کچھ شک نہیں رب العالمین کی طرف سے ہے۔''

پس تفصیل کا لفظ ایک نسبتی لفظ ہے۔

﴿وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ سے مراد:

علاوہ ازیں ﴿وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ میں دنیا کی ہر ایک چیز تو بہر حال مراد نہیں۔

اہل قرآن نے بھی اب تک آریوں کی طرح یہ دعویٰ تو نہیں کیا کہ ساری دنیا کے سائنس قرآن شریف میں موجود ہیں۔ تاریخ، جغرافیہ، ہندسہ وغیرہ کو چھوڑ و۔ دنیا کے مختلف پیشوں کا ذکر قرآن شریف میں کہاں ہے؟ دنیا کی ساری تاریخ کہاں ہے؟ اس لیے اہل قرآن کو بھی ﴿كُلِّ شَيْءٍ﴾ پر یہ قید لگانی پڑی کہ دین کی کل باتیں۔ لیکن دین تو بہت سے اصول اور بے شمار فروع پر حاوی ہے۔ مثلاً سیاست بھی دین میں داخل ہے، معاشرت بھی، تمدن بھی۔ اگر یہ امور دین میں داخل نہ ہوتے تو قرآن شریف ان کے اصول کو کیوں بیان فرماتا؟ لیکن ان ہی امور کے فروع ہزار ہا باتوں پر مشتمل ہیں جن پر ایک زمانے کے اور ایک سوسائٹی کے انسان حاوی نہیں ہو سکتے۔ ان کا ذکر قرآن شریف میں کہیں نہیں ہے۔ اسی طرح گزشتہ انبیاء کے تذکروں کو بھی دین میں داخل کیا کیونکہ ان کا ذکر قرآن شریف میں کیا۔ مگر بایں یہ نہ کیا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کے مفصل تذکرے قرآن شریف میں کر دیئے ہوں۔ بلکہ بعض انبیاء کی زندگی کے نہایت قلیل واقعات کا ذکر کیا اور بعض کے متعلق تو یہ صاف فرما دیا کہ ﴿وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ﴾ [النساء: 164:4] ''بعض رسولوں کا ہم نے تم پر کوئی ذکر نہیں کیا۔'' ان کے نام بھی قرآن شریف میں نہیں۔ ﴿وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ کس طرح ہوا؟

اب قرآن شریف کے محاورہ کو دیکھئے۔ ایک ملکہ کی نسبت فرماتا ہے: ﴿وَأُوتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ﴾ ''اس کو ساری چیزیں دی گئیں۔'' اب اہل قرآن کے اصول کی رو سے ہم اس پر اس قدر حد بندی تو لگا سکیں گے کہ بادشاہت کے متعلق کل چیزیں اس کو دی

گئیں۔لیکن اس سے زیادہ نہیں۔جس طرح ﴿وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ میں کل امور دینی مراد لیتے ہیں۔ ایسا ہی ذوالقرنین کے ذکر میں آتا ہے: ﴿وَ اٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا﴾ ''ہم نے اس کو ہر ایک چیز کے سامان عطا فرمائے۔'' یہاں بھی زیادہ سے زیادہ بادشاہت کے سامان کی قید اصول اہل قرآن کی رو سے لگانی چاہئے۔مگر کیا یہ صحیح ہے کہ اس ملکہ کو اور ذوالقرنین کو بادشاہت کے وہ سامان یا بادشاہت کی وہ چیزیں بھی دی گئی تھیں جو آج ایک طاقتور حکومت کے ہاتھ میں ہوسکتی ہیں۔مثلاً کیا یہ آہن پوش، یہ 17 انچ دہانہ کی توپیں، یہ ہوائی جہاز، یہ مشین گنیں، یہ ریلیں، یہ تار، یہ ٹیلیفون وغیرہ سب چیزیں ملی تھیں، ہرگز نہیں۔حقیقت یہ ہے کہ ﴿وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ سے مراد صرف یہ ہے کہ ان کو وہ ہر ایک چیز دی گئی جس کی ضرورت ان کو دشمن کے مقابل پر تھی۔

اسی طرح قرآن شریف ﴿وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ بے شک ہے مگر اس لحاظ سے کہ جس قدر ضرورت اعدائے دین کے مقابل پر ہے۔جس قدر ضرورت دوسرے مذاہب کے متعلق ہے۔جن سے دنیا میں اسلام کو کام پڑنا تھا۔یہی وجہ ہے کہ جہاں قرآن شریف کو ﴿وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ کہا ہے وہاں ساتھ ہی دوسرے مذاہب کا بھی ذکر ہے: ﴿مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ [یوسف:111:12] ''یہ کوئی افتراء کی کوئی بات نہیں بلکہ جو کچھ اس سے پہلے موجود ہے اس کی تصدیق اور ہر شے کی تفصیل ہے۔'' اور دوسری جگہ: ﴿وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ الْكِتٰبِ﴾ [یونس:37:10] فرما کر اور بھی واضح کر دیا۔ایسا ہی:

﴿اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ﴾ [الانعام: 114:6] کتاب مفصل کا ذکر مخالفین کو مخاطب کر کے ہی کیا ہے اور درحقیقت ان سب آیات میں یہ بتایا ہے۔ جیسا کہ قرآن شریف نے دوسری جگہ بھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ قرآن شریف میں اپنی صداقت کے تمام دعاوی اور ان کی دلائل اور مخالف مذاہب کے سارے اصول باطلہ اور ان کے بطلان کے دلائل موجود ہیں۔ اور یہ فی الواقع سچی بات ہے جیسا کہ سلسلہ احمدیہ کے بانی حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی نے اس بات کو بارہا مخالف مذاہب کے سامنے پیش کیا۔ اور اپنے تمام دلائل کا مآخذ قرآن شریف کو ثابت کر کے دوسروں سے مطالبہ کیا جس کو آج تک کسی دوسرے مذہب کا کوئی پیرو اپنی کتاب کے متعلق ثابت نہیں کر سکا۔ اس میں فی الواقع قرآن شریف کی عظمت کا کمال نظر آتا ہے کہ ملک عرب کا ایک اُمی وہ کتاب دنیا میں پیش کرتا ہے جس نے نہ صرف سارے مذاہب کے اصول باطلہ کو ہی بیان کر کے ان کی غلطی کا اظہار کیا بلکہ اس کے دلائل بھی پیش کئے۔ حالانکہ وہ ایسا شخص ہے کہ دوسرے مذاہب کا مطالعہ تو ایک طرف رہا۔ وہ لکھنا پڑھنا ہی نہیں جانتا اور اسی طرح تمام اصول حقہ کو بیان کر کے ان کی صداقت کے دلائل بھی بیان کرتا ہے۔ ﴿لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ﴾ [الانفال: 42:8] غرض کہ یہ قرآن شریف کا ایک عجیب معجزہ ہے کہ یہ دعویٰ بھی خود کرتا ہے اور دلیل بھی خود دیتا ہے اور اسی کی طرف ﴿وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ میں اشارہ ہے کہ وہ ہر چیز جس کی ضرورت مخالف مذاہب یا اعدائے دین کے مقابلہ میں ہے

وہ اس قرآن شریف کے اندر موجود ہے۔ اس کا پیرو اس کا محتاج ہے۔ یہ نہیں کہ دوسری کتابوں کی طرح کتاب اپنے پیروؤں کی محتاج ہو۔ یہ پہلوں کی تصدیق بھی کرتا ہے یعنی یہ بھی سکھاتا ہے کہ فی الواقع تمام انبیاء خدا کی طرف سے آئے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی اپنی قوم کی ہدایت کے لیے ان پر کتابیں اتاریں اور ساتھ ہی ہر شے کی تفصیل بھی اس کے اندر موجود ہے۔ یعنی جو غلطیاں ان میں داخل ہوگئیں ان کو بھی بتاتا ہے اور ان کے بالمقابل صحیح اصول کو بھی بیان کرتا ہے اور دعویٰ کے ساتھ دلائل بھی خود دیتا ہے۔ اسی لیے فرمایا ﴿فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝﴾ [البینۃ:3:98]

کس قدر کمال کا معجزہ ہے کہ اول یہ بتایا کہ سب مذاہب خدا کی طرف سے ہیں۔ پھر یہ بتایا کہ ان کی کتابوں میں تحریف ہوگئی اور مرور زمانہ سے غلطیاں داخل ہوگئیں۔ پھر جو اصولی غلطیاں تھیں وہ بتائیں۔ پھر ان غلطیوں کے دلائل دیئے۔ ان واقعات پر غور کرو اور پھر ﴿تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ [یوسف:111:12] کو پڑھو تو معلوم ہوگا کہ واقعی یہ خدائے عالم الغیب کا کلام ہے۔ اور واقعی وہ شخص بھی خدا کی طرف سے تھا جس پر اس علمی زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کا یہ علمی معجزہ ظاہر فرمایا۔

اصول اور فروع کا فرق:

ایک اور پہلو سے ہم اسی ﴿وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ کے دعویٰ پر غور کرتے ہیں تو

معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے دین کے متعلق ہر معاملہ کے اصول کو بیان کر دیا ہے اور فروع میں سے بھی کچھ بیان کر دیا ہے۔ نہ صرف دین اسلام کے اصول ہی یعنی اللہ تعالیٰ اور فرشتوں اور کتابوں اور رسولوں اور یوم آخرت پر ایمان بلکہ سیاست، تمدن، معاشرت کے اصول بھی، دنیا میں اختلاف مذہب کے اصول بھی، اس اختلاف میں فیصلے کے اصول بھی وغیرہ۔ مگر فروع کا نہ استقصا ہوسکتا تھا اور نہ اس لاحاصل کوشش کو قرآن شریف نے کیا۔ ہاں بطور نمونہ اور ضرورت کے لحاظ سے اس میں سے بھی کچھ بیان کر دیا۔ لیکن جملہ اصول کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کر دیا اور پھر یہ قاعدہ بھی بتا دیا کہ فروع میں جہاں کوئی امر متشابہ پیدا ہو اصول کی طرف رجوع کر کے اسے حل کیا جائے۔ اس لیے ﴿وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ قرآن شریف ان معنوں میں بھی ہے کہ تمام اصول کی تفصیلات اس کے اندر موجود ہیں اور پوری وضاحت موجود ہے۔ وہاں کسی مزید توضیح کی چنداں حاجت نہیں۔ چنانچہ اس امر کو خود قرآن شریف نے بیان فرمایا ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ﴾ [آل عمران: 7:3] ''خدا وہ ہے جس نے تجھ پر کتاب اتاری اس میں کچھ آیات محکم یعنی واضح المعنی صریح الدلالت ہیں وہ کتاب کی اصل ہیں اور اَور متشابہ ہیں۔'' یعنی جن کے معنی واضح نہیں۔ اب اس آیت نے صاف کر دیا کہ قرآن کریم میں بعض آیات ایسی ہیں جو واضح المعنی نہیں بلکہ ان کی مزید تشریح و توضیح بکار ہے۔ پس اگر قرآن شریف ایک طرف ﴿وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ بھی اپنے آپ کو کہتا ہے تو دوسری طرف اپنے اندر کچھ آیات متشابہ بھی قرار دیتا ہے۔ ہم دونوں آیتوں کو اکٹھا پڑھیں

گے اور ان میں سے ایک کے ایسے معنی نہیں کریں گے جو دوسری آیت کے خلاف ہوں اور دونوں میں تطبیق بھی درحقیقت خود اسی آیت نے کردی ہے جو اس وقت زیر بحث ہے۔ کیونکہ یہاں ایک حصہ کو واضح المعنی صریح الدلالت فرمایا دوسرے کو ایسا نہیں فرمایا۔ اور یہ بھی بتادیا کہ وہ آیات جو واضح المعنی صریح الدلالت ہیں وہ اصول کتاب ہیں۔ بالفاظ دیگر قرآن کریم نے اصول کو لازماً ایسے الفاظ میں بیان فرمادیا ہے کہ ان کی مزید توضیح کی ضرورت نہیں۔ مگر فروع کو ایسے رنگ میں بیان فرمایا ہے کہ ان کی مزید توضیح کی ضرورت ہے اور یہی ایک حکیم اور پُرحکمت کتاب کا کام ہوسکتا تھا کہ اصول کو نہایت پختہ اور مضبوط کر کے بیان کردے اور فروع میں سے کچھ حصہ کو بیان کردے۔ کیونکہ تمام فروع کو بیان کردینا گو خدائے عالم الغیب کی طاقت سے تو بڑھ کر نہیں مگر ان تمام فروع کا برداشت کرنا ان سب کی حفاظت کرنا اور ان میں سے پھر اپنی ضرورت کے مطابق تلاش کرنا انسانی طاقت سے بالاتر تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے نہیں چاہا کہ انسان پر وہ بوجھ ڈالے جس کی وہ برداشت نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اس طرح تو یہ قرآن کریم کروڑوں نہیں اربوں صفحوں کی کتاب بن جاتی اور کوئی اس میں سے کچھ بھی حاصل نہ کرسکتا، نہ اسے یاد رکھ سکتا، نہ اس کی حفاظت کا سامان ہوسکتا۔ پس کمال حکمت سے ایک طرف اصول کو بالکل واضح اور صاف اور پختہ کر کے قرآن کریم میں ان سب کا ذکر کردیا اور دسری طرف فروع کے لیے اجتہاد کا دروازہ ہر زمانہ میں اس کی ضرورت کے مطابق کھلا رکھا۔ اب چونکہ فروع ہمیشہ اصول پر عرض کی جاتی ہیں۔ اور اصول کے مطابق ہونی چاہئیں۔ اس لیے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ سبھی کچھ بتا بھی دیا کیونکہ جب ایک چیز کے علم

حاصل کرنے کا ذریعہ بتادیا تو گویا اس کا علم ہی دے دیا اور اس لحاظ سے یعنی مجاز کے رنگ میں ﴿وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ قرآن شریف اس معنی میں بھی ہے کہ اس میں سب چیزوں کا علم دے دیا کیونکہ سب چیزوں کے علم حاصل کرنے کا رستہ بتادیا۔ چنانچہ اس آیت میں خود ہی اس قاعدہ کی توضیح بھی فرمادی: ﴿وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ۗ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِندِ رَبِّنَا﴾ [آل عمران:7:3] ''اور اس کی (یعنی متشابہ کی) تاویل کوئی نہیں جانتا۔ مگر اللہ اور مضبوط علم والے۔ وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔'' یعنی متشابہ کے معنی رَاسِخٌ فِي الْعِلْمِ لوگ اسی اصول پر معلوم کرتے رہیں گے کہ وہ سب کو اپنے رب کی طرف سے جانتے ہیں۔ رَاسِخٌ فِي الْعِلْمِ ان کو اس لیے کہا کہ وہ ایک مضبوط بنیاد پر کھڑے ہوتے ہیں۔ اور وہ بنیاد یہی ہے کہ وہ محکم اور متشابہ دونوں کو خدا کی طرف سے مانتے ہیں اور محکم کے معنی تو ظاہر ہیں۔ سو جس کے معنی میں کسی قسم کی بحث نہیں۔ متشابہ کو اس پر عرض کرنا خود ایک مضبوط بنیاد پر کھڑے ہونا ہے۔ پس یہ وہ قاعدہ ہے جو خود قرآن کریم نے تجویز فرمایا۔

قرآن کریم میں متشابہات کی حکمت:

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ اصول جو قرآن کریم نے اوپر بتایا ہے ساری مشکلات کو حل کر دیتا ہے۔ قرآن شریف میں ایک رنگ میں سبھی کچھ موجود ہے مگر نہ اس طرح جیسے لفظ پرستوں نے خیال کرلیا ہے۔ ہاں بیج کے طور پر اس میں سب کچھ ہے اور

اس بیج کو درخت بنانے کی طاقت اللہ تعالیٰ نے انسان کو دی ہے۔ متشابہ آیات کو صرف اسی قدر نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ ان کے معنی میں وضاحت نہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ متشابہ آیات وہ ہیں جو بہت سی معنی کی متحمل ہوسکتی ہیں۔ اور ایک طرف اگر آیات محکم نے دنیا پر یہ احسان کیا کہ اول کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے تا کہ ان کے متعلق شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہے، تو دوسری طرف متشابہ آیات کا کوئی کم احسان دنیا پر نہیں۔ اس لیے کہ ان کے اندر وہ ذخائر علم بھرے پڑے ہیں جن سے آخر تک دنیا متمتع ہوتی رہے گی۔ وہ ذخائر علم بے شک اپنی خوراک ان اصول سے ہی حاصل کرتے ہیں جس طرح ایک درخت کی شاخیں غذا اپنی جڑوں کے ذریعہ سے حاصل کرتی ہیں۔ مگر بجائے خود وہ اس ہدایت میں جس نے دنیا کے آخر تک قائم رہنا تھا اسی قدر ضروری عنصر ہیں جس قدر ضروری کہ محکمات ہیں۔ اگر یہ قدرتی تقسیم قرآن شریف کے اندر نہ ہوتی جو اللہ تعالیٰ کا آخری کلام شریعت وہدایت تھا تو وہ صحیفہ قدرت کے مطابق نہ ہوتا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہی چاہا کہ جو قانون اس کی اس کتاب میں کام کرتا ہوا نظر آتا ہے جو اس کے ہاتھوں نے بنائی ہے بعینہٖ وہی قانون اس کی اس کتاب میں بھی کام کرتا ہوا نظر آئے جو اس کے منہ کا کلام ہے۔ اور چونکہ یہ کمال اس کتاب میں ظاہر کرنا مقصود تھا اس لیے جس قدر قرآن کریم نے بار بار نظارہ قدرت کی طرف توجہ دلائی ہے کسی الہامی یا غیر الہامی کتاب نے اس قدر توجہ نہیں دلائی۔

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی

الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ [آل عمران:3:190] کے رنگ کی آیات اگر کوئی جمع کرنا چاہے تو سینکڑوں آیتیں قرآن شریف میں ملیں گی۔ پس جس طرح ایک مضبوط جڑوں کے درخت کے ہمیشہ نئے سے نئے پتے نکلتے رہتے ہیں اسی طرح تا قیامت قرآن شریف سے نئے سے نئے علم پیدا ہوتے رہیں گے۔ اور ہر ایک قسم کی ضروریات کو وہ پورا کرتا رہے گا مگر وہ بطور ایک اصل کے ہوگا اور اس سے ہر قسم کی فروع پیدا ہوتی رہیں گی۔ محکم اور متشابہ آیات اپنا اپنا کام کرتی رہیں گی اور یوں دنیا کے لیے آخر تک روحانی غذا کے پیدا کرنے کا موجب ہوتی رہیں گی۔ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اسی میں کل فروع کا احاطہ فوری رنگ میں پائے وہ خدا کے کلام سے وہ توقع رکھتا ہے جو اس کے قانون کے خلاف ہے اور وہ نہ صرف قرآن کریم سے ہی ناواقف ہے بلکہ عقل انسانی سے بھی کام نہیں لیتا۔

باریکیوں کو اخذ کرنے والوں کے مدارج کا اختلاف:

اس تمام بحث کو پڑھ لینے کے بعد کسی شخص کو اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہوسکتی کہ قرآن کریم کی آیات کی مزید تفصیل وتشریح کی بھی ضرورت ہے اور ان لوگوں نے بھی اپنے عمل سے اس کا اعتراف کیا ہے جنہوں نے اپنے قول سے اس کی تردید کی تھی۔ میں نے اوپر اللہ تعالیٰ کے اسی قولی کتاب کا اس کی فعلی کتاب سے مقابلہ کیا ہے اور اسی کو ذرا اور کھولا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس طرح خدا تعالیٰ کی فعلی کتاب یعنی اس کی مخلوقات میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یوں تو وہ سب کے سامنے کھلی پڑی ہیں لیکن اس کو دیکھنے میں سب یکساں نہیں۔ بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ وہ اس کے موٹے سے موٹے واقعات کو نہیں

دیکھتے اور آنکھیں رکھتے ہوئے آنکھیں بند کر کے اس کے نشانات سے گزر جاتے ہیں۔ اور بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ مخلوقات سماوی اور ارضی کے اندر ایک باریک نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس پر فکر کرنے کی عادت رکھتے ہیں۔ وہ پہلوں سے بہت زیادہ باریکیاں اس کھلی ہوئی کتاب میں سے اخذ کر سکتے ہیں۔ ان سے آگے ایک گروہ علم دانوں کا ہے جنہوں نے اپنی باریک نگاہ سے قانون قدرت کی بعض باریکیوں کو ایسا اخذ کر لیا ہے کہ وہ ان چیزوں کو دیکھتے ہیں جن کو عام نگاہ نہیں دیکھ سکتی اور ان طاقتوں کو اپنے کام میں لاتے ہیں جن کو دوسرے نہیں لا سکتے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ایک گروہ سائنس دانوں کا ہے جو خوردبین کی مدد سے ایسی ایسی مخفی باتوں کو دیکھ لیتے ہیں جن کو نہ صرف انسان کی چشم بینا ہی نہیں دیکھ سکتی بلکہ وہاں تک فکر و عقل کی بھی رسائی نہیں۔ یہی نظارہ ہم کو اللہ تعالیٰ کی قولی کتاب یعنی قرآن شریف میں نظر آتا ہے۔ یعنی بہتیرے لوگ ہیں جو اس کو پڑھتے ہیں مگر اس کی موٹی موٹی باتوں سے بھی بے خبر رہتے یں۔ بعض پڑھتے ہیں اور اس سے بہت کچھ سیکھتے ہیں اور اس کی بہت سی باریک باتوں تک ان کی نگاہ جاتی ہے۔ اس سے اوپر آئمہ مجتہدین کا گروہ ہے جو فکر و تدبر سے کام لے کر اجتہاد کر کے اور بہت سے باریک مسائل کو قرآن شریف سے اخذ کرتے ہیں۔

نبی کا فہم وحی خفی ہے:

لیکن نبی کو جس پر وہ کلام نازل ہوتا ہے وہ خوردبین عطا کی جاتی ہے جس کی مدد سے وہ وہ کچھ دیکھتا ہے جو دوسروں کو نظر نہیں آتا۔ اور بہت سی باتیں جو کتاب اللہ میں

ایک بیج کے رنگ میں موجود ہیں نبی اپنے اس فہم سے جو اللہ تعالیٰ اسے خاص طور پر عطا کرتا ہے انہیں درخت کی صورت میں دیکھ لیتا ہے۔ وہ روشنی جو اس کو دی جاتی ہے وہ معمولی اجتہاد سے بالاتر اور زیادہ تیز روشنی ہوتی ہے۔ اسی کو وحی خفی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور اگر غور کیا جائے تو یہ بات ظاہر ہے کہ جس قلب پر وحی الٰہی کا نزول ہوتا ہے اس کو اس کا خاص فہم بھی ملنا ضروری ہے۔ کیونکہ وہ اس کو دوسروں کی طرح باہر سے نہیں دیکھتا بلکہ اندر سے دیکھتا ہے۔ اس کے قلب میں جب تک ایک خاص نور پیدا نہیں کیا جاتا اس وقت تک وہ اس وحی کو لینے کے قابل کیونکر ہوسکتا ہے۔ ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ [الانعام: 124:6] صاف بتاتا ہے کہ وحی الٰہی پانے کا ہر ایک قلب سزاوار نہیں ہوتا۔ پس یہی نور جس کی وجہ سے اس کا قلب مہبط وحی بنتا ہے اس کو ایک خاص فہم عطا کرنے کا موجب ہوتا ہے۔ اور اسی خاص فہم سے کام لے کر یا وحی خفی کی مدد سے وہ ان امور دینی میں فیصلہ کرتا ہے، جن کی وضاحت کتاب اللہ نے نہیں کی۔ اور اس وجہ سے کہ اس کو خاص فہم منجانب اللہ عطا ہوتا ہے اور خاص روشنی ملتی ہے۔ وہ خاص اختیارات رکھتا ہے۔ اس کا فیصلہ امت کے لیے ایک قطعی فیصلہ ہوتا ہے۔ اجتہاد میں غلطی کا امکان ہے مگر اس کے فیصلہ دینی میں غلطی کا امکان نہیں۔

مثلاً قرآن شریف میں صلوٰۃ کا حکم ہوتا ہے اور آنحضرت ﷺ بتا دیتے ہیں کہ صلوٰۃ یہ ہے۔ اب یہ ناممکن ہے کہ جو کچھ آپ نے فرمایا ہے وہ غلط ہو یا قرآن شریف یا اللہ تعالیٰ کی منشا کے خلاف ہو۔ اور کسی دوسرے شخص کو معلوم ہو جائے کہ وہ نماز جو رسول

اللہ ﷺ نے بتائی تھی وہ درست نہیں بلکہ قرآن شریف ایک دوسری طرز کی نماز چاہتا ہے۔ ایک فیصلہ دینی اگر قطعی طور پر رسول کریم ﷺ سے ثابت ہے تو اس کا قبول کرنا سب امت کے لیے ضروری ہے۔

نبی کو خاص فہم دیا جاتا ہے:

اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ کیا قرآن شریف سے یہ ثابت ہے کہ نبی کو کوئی خاص فہم عطا ہوتا ہے؟ جس سے وہ امور دینی میں فیصلہ کرنے کا مجاز ہوتا ہے۔ بلاشبہ ایسا ثابت ہوتا ہے اور قرآن کریم کی متعدد آیات اس پر گواہ ہیں۔

یوں تو کسی نبی کے متعلق فرمایا: ﴿وَلُوطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا﴾ [الانبیاء:74:21] کسی کے متعلق فرمایا: ﴿فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٢١﴾﴾ [الشعراء:21:26] یا فرمایا: ﴿وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰٓى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا﴾ [القصص:14:28] لیکن جامعیت کے رنگ میں ایک جگہ کوئی اٹھارہ انبیاء کے نام لے کر فرمایا: ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ﴾ [الانعام: 89:6] ''یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور فیصلہ کرنے کا اختیار اور منصب سفارت (اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان) عطا فرمایا ہے۔'' اور دوسری جگہ اس سے بھی زیادہ عام الفاظ میں فرمایا: ﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ [آل عمران: 79:3] ''یہ کسی بشر کو

شایاں نہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے کتاب اور فیصلہ کرنے کا اختیار اور منصب سفارت عطا فرمائے پھر وہ لوگوں کو کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ۔''

حکم کے معنی امام راغب نے ان الفاظ میں کیے ہیں:

أَنْ يُّقْضٰى بِشَيْءٍ عَلٰى شَيْءٍ فَيَقُوْلُ هُوَ كَذَا وَلَيْسَ بِكَذَا.

یعنی ''ایک چیز کا دوسرے پر فیصلہ کیا جائے۔ پس وہ فیصلہ کرنے والا کہے یہ ایسا ہے اور ایسا نہیں۔''

پس ان آیات سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ جہاں اپنے مرسلین کو کتاب دیتا ہے، منصب سفارت عطا فرماتا ہے وہیں ان کو حکم یعنی فیصلہ کرنے کی قوت یا فیصلہ کرنے کا اختیار دیتا ہے۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ انبیاء سب بادشاہ نہیں ہوتے۔ پس یہ فیصلہ صرف دینی امور میں ہی فیصلہ ہے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ حُکْم کے معنی لغت میں اَلْعِلْمُ وَالْفِقَّةُ یعنی علم و فقاہت بھی لکھے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ فیصلہ کرنے کی قوت یا اختیار کے لیے علم و فقاہت بھی بکار ہے۔ اور صحیح حکم یا فیصلہ چونکہ فقاہت سے ہی پیدا ہوتا ہے اس لیے نبی کو حکم عطا کرنے میں دونوں مفہوم پائے جاتے ہیں، یعنی اس کو خاص فہم بھی دیا جاتا ہے اور فیصلہ کرنے کا اختیار بھی دیا جاتا ہے۔ اس لیے بعض وقت یہ صرف فہم کے معنے میں بھی استعمال ہوا ہے یعنی حکمت کے معنی میں۔ مگر ظاہر ہے کہ کتاب اور نبوت کے ساتھ انبیاء کو جو حکم عطا کرنے کا ذکر ہے اس سے مراد اختیار فیصلہ ہی ہے یا کتاب کا وہ فہم

جس سے وہ امور دینی میں فیصلہ کر سکتے ہیں معمولی فہم مراد نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اس کا تعلق نبوت سے کیا ہے۔ یہ کوئی خاص بات ہے جو انبیاء علیہم السلام کو عطا ہوتی ہے۔ جس طرح ﴿اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا﴾ میں علم سے مراد خاص علم ہے جو امور دینی کے متعلق منجانب اللہ دیا جاتا ہے۔ ورنہ علم تو کم وبیش ہر ایک انسان کو دنیا میں ملتا ہے اور خدا کی طرف سے ہی ملتا ہے۔ یہاں تک کہ جو شخص لکھنا سیکھتا ہے وہ بھی منجانب اللہ ہی علم لیتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ﴾ [البقرۃ: 282:2] ''کاتب کو چاہئے کہ لکھنے سے انکار نہ کرے، جیسا کہ اللہ نے اسے لکھنا سکھایا۔'' یا شکاری جانور کو شکار کرنا سکھایا۔ یہ بھی علم اللہ ہی دیتا ہے۔ حالانکہ اس کا دین سے کچھ بھی تعلق نہیں۔ جیسے کہ فرمایا: ﴿وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ﴾ [المائدۃ: 4:5] ''اور وہ جو تم شکاری جانوروں کو سکھاتے ہو (یعنی شکار کرنا سکھاتے ہو۔) تم ان کو سکھاتے ہو اس سے جو اللہ نے تم کو سکھایا۔''

پس گو خدا کا انسان کو علم دینا نہایت وسیع ہے مگر جب وہ نبی کے متعلق فرماتا ہے کہ اس کو ہم نے علم دیا تو اس سے مراد وہ عام علم نہیں جو انسان اپنی کوشش سے سیکھ لیتا ہے (گو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ اسباب سے اور اسی کی پیدا کردہ طاقتوں سے وہ سیکھتا ہے وہ بھی خدا کا ہی دیا ہوا علم ہے۔) بلکہ اس سے مراد وہ علم خاص ہے جو انبیاءؑ کو بذریعہ وحی اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے۔ اسی طرح حکم سے مراد وہ معمولی فہم یا دنیا کے قضایا میں فیصلہ نہیں ہوسکتا جس میں دوسرے انسان ان کے شریک حال ہیں بلکہ یہ وہ خاص فہم

ہے جو وحی خفی سے ملتا ہے جس میں دوسرے انسان ان کے شریک حال نہیں۔ اور یہ وہ اختیار فیصلہ ہے جو دینی امور میں ان کو دیا جاتا ہے جس میں دوسرے انسان ان کے شریک نہیں۔ پس یہ آیات قرآنی اس بات کا قطعی فیصلہ کرتی ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کو امور دینی میں فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جاتا ہے۔ اور ایسا فیصلہ کرنے کے لیے انہیں خاص فہم دیا جاتا ہے جسے وحی خفی کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ معمولی فہم انسانی سے ایک الگ روشنی ہے۔

نبی کو امور دینی میں فیصلہ کرنے کا اختیار:

اس بات پر کہ نبی کو امور دینی میں کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔ یہ اعتراض کیا جاتا ہے جس کو اصولی اعتراض سمجھا جاتا ہے کہ حکم تو اللہ کے لیے خاص ہے۔ ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ ''نہیں حکم مگر اللہ کے لیے۔'' ﴿وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ۝﴾ ''اور اپنے حکم میں وہ کسی کو شریک نہیں کرتا۔'' ایسا ہی اور بھی بہت سی آیات ہیں: ﴿وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ﴾ [الشوریٰ:10:42] ﴿وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ﴾ [الرعد:41:13] ﴿فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ﴾ [المؤمن:12:40]

تعجب ہے کہ ان آیات سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی دوسرے کو دنیا میں حاکم بننے کی یا حکم کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ آیات قرآنی کے وہ معنی کرنا جو صریحاً خلاف واقعات ہوں عقلمندی نہیں۔ دنیا میں حاکم بھی بنتے ہیں، حکم دیتے بھی ہیں، چلاتے بھی ہیں۔ مگر جلد بازی سے اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ امور دینی میں کوئی حکم

نہیں دے سکتا۔ جائے غور ہے کہ قرآن نے امور دینی کی قید کوئی نہیں لگائی۔ نہ ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ میں امور دینی کی کوئی قید ہے نہ ﴿وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا﴾ میں امور دینی کی کوئی قید ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین کے ماتحت کوئی حکم دینا شرک ہے تو خواہ ایسا حکم دنیا سے تعلق رکھتا ہو یا دین سے بات یکساں ہے۔ حکم میں شریک تو ہو گئے اور اگر یہ شرک نہیں تو پھر تمام آیات کے مفہوم کو ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ پیش کر کے بگاڑتے چلے جانا ﴿فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ﴾ کا مصداق نہیں تو اور کیا ہے؟ اصل بادشاہ دین و دنیا دونوں کا خدا ہی ہے۔ اور کچھ قوانین کے ماتحت جو اس نے بعض کو بعض کے ماتحت رکھا ہے اور اس کا حکم ماننے کو کہا ہے تو اس کو شرک فی الحکم قرار دینا سوائے اس کے نہیں ہوسکتا کہ انسان عقل و فکر سے کام نہ لے۔ مثلاً کم از کم یہ تو مولوی عبداللہ صاحب کو بھی مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امور سلطنت میں اولی الامر کی اطاعت یعنی ان کا حکم ماننے کا حکم دیا ہے۔ پس اگر وہ خود حکم دے کہ فلاں کی بات بھی مان لیا کرو تو یہ بھی اسی کا حکم ہوا۔ امور سیاست دین سے الگ نہیں۔ اگر یہ الگ ہوتے، اگر یہ ہمارے دین کا جزو نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ کیوں اولی الامر یعنی بادشاہوں کی اطاعت کا حکم دیتا۔ غرض یہ بات نہایت صاف ہے، بادشاہوں کی اطاعت کا حکم دینا صاف بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بھی دین کا ہی حصہ رکھا ہے اور باوجود سیاست کو دین کا حصہ رکھنے کے پھر بھی حکم دیا ہے کہ بادشاہوں کی اطاعت کرو۔ اور پھر ﴿وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ۝۲۶﴾ میں کوئی قید امور دینی کی نہیں ہے۔ پس جس طرح امور سیاسی میں بادشاہوں کی اطاعت شرک فی

الحکم نہیں۔ اسی طرح کسی امر میں انبیاء علیہم السلام کی اطاعت کے یہ معنی نہیں کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے حکم میں دوسرے کو شریک کر دیا۔ نہیں، بلکہ ہم تو اللہ کے حکم کے ماتحت ہی اس کا حکم مانتے ہیں۔ پس حق یہی ہے کہ حکم تو پھر بھی صرف خدا کا ہی رہا اور کوئی شخص شریک فی الحکم نہ ہوا۔

حَکَم کے ماتحت حَکَم:

اس کی اور بھی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ قرآن کریم میں ایک جگہ اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے: ﴿اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا﴾ ''کیا میں اللہ کے سوا کوئی دوسرا حکم چاہوں؟'' یعنی فیصلہ کرنے والا۔ لیکن دوسری جگہ خود ہی فرماتا ہے کہ میاں بیوی میں جھگڑے کے وقت یوں کیا کرو: ﴿فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا﴾ ''ایک حکم مرد کے گھر والوں سے اور ایک حکم عورت کے گھر والوں سے مقرر کرو۔'' اب اشتراک لفظی کو دیکھئے۔ ایک طرف حکم ہوتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو حَکَم بنانا جائز نہیں۔ دوسری طرف ایک معمولی خانگی جھگڑے میں حکم ہوتا ہے کہ دو حَکَم مقرر کرلو۔ اگر وہی طریق استدلال ہے جو ہمارے اہل قرآن کہلانے والے دوست اختیار کرتے ہیں کہ جب حکم اللہ کے لیے خاص ہے تو کسی اور کو حَکَم ماننا شرک ہے تو اللہ کے سوائے دوسرے کو حَکَم بنانے کی تعلیم دے کر پھر کیا قرآن نے خود شرک سکھایا؟ حکم وہ بھی ہیں مگر اصلی حَکَم اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ فیصلہ ان کا بھی بالضرور قبول کرنا ہوگا۔ اسی لیے ان کو حَکَم کہا ہے مگر چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت حَکَم بنتے ہیں اس لیے یہ شرک نہیں۔ امام راغب نے

لکھا ہے کہ ان کو کیوں حَکم کہا؟ اور حاکم نہیں کہا: [تَنْبِيْهًا إِنَّ مِنْ شَرْطِ الْحَكَمَيْنِ أَنْ يَّتَوَلَّيَا الْحُكْمَ عَلَيْهِمْ] یعنی یہ بتانے کے لیے کہ حَکم کی شرط یہ ہے کہ وہ ان پر حکم کا متولی ہوتا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کے فیصلہ کو بھی اللہ تعالیٰ نے حکم ہی کہا ہے:

﴿وَ دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَ كُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَ كُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا﴾ [الانبیاء:21:78-79]

''اور داؤد اور سلیمان جب کھیتی کے بارے میں فیصلہ کرتے تھے۔ جب رات کے وقت اس میں لوگوں کی بکریاں جا پڑیں اور ہم ان کے حکم کے گواہ تھے۔ پس ہم نے سلیمان کو سمجھا دیا اور دونوں کو ہم نے حکم اور علم دیا تھا۔''

اب ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ بھی درست ہے یعنی حکم اللہ کے سوائے کسی کا نہیں اور یہ بھی درست ہے کہ داؤد اور سلیمان علیہما السلام دونوں کو حکم یا فیصلہ کرنے کا اختیار دیا تھا۔ خواہ وہ کسی معاملہ میں ہو مگر حکم ہی تھا۔ یہ بھی شرک نہیں؛ کیونکہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھا۔ پس معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت کسی کا حکم دینا خلاف منشائے قرآن کریم نہیں بلکہ عین اس کے منشا کے مطابق ہے۔ اور ایسا ہی اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت کسی کا حکم بننا بھی خلاف منشائے قرآن کریم نہیں۔

قرآن میں اطاعت رسول کا ذکر:

اب جب یہ امر ثابت ہو گیا کہ اگر اللہ تعالیٰ خود کسی دوسرے کا حکم ماننے کا حکم دے تو وہ ﴿وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهٖٓ اَحَدًا﴾ اور ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ کے خلاف نہیں۔ تو ہم ان آیات کو پیش کرتے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی اطاعت کا یا آپ کے حکم ماننے کا یا آپ کو حَکَم بنانے کا حکم دیا ہے۔ ایسی کسی آیت کے خلاف اب یہ دلیل پیش نہ ہو سکے گی کہ اس آیت کے ایسے معنی کرنا خلاف قرآن ہے۔ کیونکہ قرآن شریف اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت دوسرے کے حکم کے ماننے کو جائز رکھتا ہے۔ قرآن شریف میں ایسی آیات جن میں صرف رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا کھلے الفاظ میں ذکر ہے بیس ہیں۔ اور مختلف الفاظ میں یہ ذکر موجود ہے۔ پہلے میں ان آیات کو لکھ دیتا ہوں:

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ [النساء:4:80] ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ﴾ [النساء:4:69] ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ [النساء:4:13؛ النور:24:52؛ الاحزاب:33:71؛ الفتح:48:17] ﴿وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ [التوبۃ:9:71] ﴿وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ [الحجرات:49:14] ﴿قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ﴾ [آل عمران:3:32] ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ [النساء:4:59؛ محمد:47:33] ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ [الانفال:8:20] ﴿قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ [النور:24:54] ﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ﴾ [آل عمران:3:131] ﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ [المائدۃ:5:92؛ التغابن:64:12] ﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ

وَرَسُوْلَهٗ﴾ [الانفال:8:1، 46؛ المجادلۃ:58:13] ﴿وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ [النور:24:56] اور بارہ آیات ایسی ہیں جن میں دوسرے انبیاء علیہم السلام نے اپنے اپنے وقت میں اپنی امتوں کو اپنی اطاعت کی طرف بلایا ہے۔ اور وہ الفاظ عموماً ایک ہی ہیں یعنی ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ﴾ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق آل عمران 50 اور الزخرف 63 میں اور حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق الشعراء 110-108 اور نوح 3 (یہاں فَاتَّقُوا اللّٰهَ کی جگہ فَاتَّقُوْهُ ہے) میں اور حضرت ہود علیہ السلام کے متعلق الشعراء 131-126 میں اور حضرت صالح علیہ السلام کے متعلق الشعراء 150-144 میں اور حضرت لوط علیہ السلام کے متعلق الشعراء 163 میں اور حضرت شعیب علیہ السلام کے متعلق الشعراء 179 میں اور حضرت ہارون علیہ السلام کے متعلق طٰہٰ 90 میں یہ لفظ ہیں: ﴿وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ﴿٩٠﴾﴾ ''اور ہارون نے انہیں پہلے سے کہہ دیا تھا۔۔۔۔سو تم میری پیروی کرو اور میرے حکم کی فرمانبرداری کرو'' اور ایک مرتبہ کل رسولوں کے متعلق عام قاعدہ بتا دیا ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ [النساء:4:64] یعنی ''ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔'' اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حَکَم بنانے کا حُکم بھی موجود ہے: ﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿٦٥﴾﴾ [النساء:4:65] ''نہیں میرے رب کی قسم ہرگز ایمان نہیں لاتے یہاں تک کہ تم کو حَکَم بنائیں اس میں جو ان میں جھگڑا ہو پھر اپنے دلوں

میں اس کے بارہ میں کوئی تنگی نہ پائیں جو تو فیصلہ کرے اور کامل فرماں برداری سے قبول کریں۔'' آپ کا حکم ماننے کے متعلق اور بھی آیات ہیں جیسے: ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ [آل عمران:3:30] ''کہو اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔'' اور ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ [الاحزاب:33:21] ''تمہارے لیے اللہ کے رسول میں نہایت عمدہ نمونہ ہے۔'' یعنی آپ کے نقش قدم پر چلو۔ بالفعل میں اسی قدر پر اکتفا کرتا ہوں کیونکہ ان آیات میں کافی سے زیادہ وضاحت موجود ہے۔

مولوی عبداللہ کی اطاعت رسول کی تفسیر:

بظاہر یہ اس قدر قوی اور صریح ثبوت رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا ہے کہ اس قدر متواتر احکام کی موجودگی میں کسی شخص کا آپ کی اطاعت سے انکار کرنا خود انکار قرآن مجید ہے۔ مگر اہل قرآن کہلانے والے لوگ اس قدر صریح آیات قرآنی کا انکار کرتے ہوئے ہمیشہ اپنے آپ کو اہل قرآن کہتے ہیں۔ ان کے انکار کی وجوہات حسب ذیل ہیں:

اول: ''سارے قرآن مجید میں جس جگہ ﴿اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ آوے وہاں سب جگہ مراد صرف کتاب اللہ المجید ہی ہوتی ہے''۔ کیونکہ لغت عرب میں رسول بمعنی رسالت بھی آیا ہے۔ اور چونکہ ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ اور ﴿وَ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا﴾ کے ماتحت کسی اور کا حکم ماننا شرک ہے

اس لیے ﴿وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ﴾ میں الرَّسُوۡلَ سے مراد رسالت ہے اور رسالت سے مراد قرآن مجید ہے۔

دوم: جہاں لفظ اَطِیۡعُوۡنِ آیا ہے اور جہاں ﴿لِیُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰہِ﴾ ہے وہاں مراد اطاعت سے موافقت ہے کیونکہ اطاعت کے معنی لغت عرب میں موافقت بھی آئے ہیں۔ پس ﴿فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوۡنِ﴾ کے معنی یہ ہوئے کہ ''اللہ کا تقویٰ کرو۔'' یعنی میرے خیال کی موافقت کرو۔ یعنی جس طرح میں اللہ سے ڈرتا ہوں اسی طرح تم ڈرو۔

سوم: ﴿وَ اَطِیۡعُوۡۤا اَمۡرِیۡ﴾ میں امر سے مراد حکم نہیں بلکہ حال و عمل و چال چلن معنی ہیں۔ پس ﴿فَاتَّبِعُوۡنِیۡ وَ اَطِیۡعُوۡۤا اَمۡرِیۡ﴾ کے معنی ہوئے ''سو تم میری پیروی کرو۔'' یعنی میرے چال چلن میں میرے ساتھ موافقت کرو۔ گویا یوں کہنا چاہئے کہ لفظ رسول اور اطاعت اور امر کا اور حرف عطف 'و' کا مفہوم مولوی عبداللہ صاحب وہ نہیں لیتے جو مفسرین قرآن نے عام طور پر لیا ہے بلکہ ان کے معنی کچھ اور لیتے ہیں اور اس تمام اختلاف معنی کی وجہ صرف ایک ہی ہے کہ قرآن شریف میں چونکہ ﴿وَ لَا یُشۡرِکُ فِیۡ حُکۡمِہٖۤ اَحَدًا﴾ اور ﴿اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ﴾ آیا ہے اس لیے کسی دوسرے کا حکم ماننا نہیں جا سکتا۔ بلکہ کسی دوسرے کا حکم دینا یا اس کا ماننا دونوں شرک ہیں۔ پس جب حکم نہیں تو فرمانبرداری کیسی؟

لیکن چونکہ یہ میں اوپر ثابت کر چکا ہوں کہ خدا کے حکم کے ماتحت کسی دوسرے کو حکم دینا ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ اور ﴿وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ۝۲۶﴾ کے خلاف نہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم نے خود لفظ حُکم اور حَکم استعمال کر کے دکھا دیا۔ پس مولوی صاحب کے ظاہر معنے سے انحراف کرنے کی کوئی وجہ نہیں اور نہ تاویلات بعیدہ ور رکیکہ کو کام میں لانے کی کوئی گنجائش ہے۔ جب قرآن شریف دوسرے کے حکم کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت جائز رکھتا ہے تو اصل میں جس بات سے غلط فہمی پیدا ہوئی تھی وہ دور ہوگئی اور ان آیات کے ظاہر معنی کی رو سے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ضروری ٹھہری۔ اور مولوی عبداللہ صاحب کی ساری بحث کا فیصلہ اس ایک بات پر ہی ہو جاتا ہے۔

واضح کی تفسیر مبہم سے:

لیکن میں مولوی صاحب کے معنی کو لے کر دکھاتا ہوں کہ یہ معنی خود ہی کسی طرح پر قابل قبول نہیں۔ اوپر کے قریباً تیس مقامات میں مولوی عبداللہ صاحب نے واؤ کو تفسیری ٹھہرا کر معنی کیے ہیں۔ مولوی صاحب کے نزدیک جہاں کہیں اللہ تعالیٰ نے ﴿يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾، ﴿وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾، ﴿اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ یا اس قسم کے لفظ فرمائے ہیں وہاں اللہ کی اطاعت کی تفسیر رَسُوْلَهٗ سے کر کے یہ بتایا کہ اللہ کی اطاعت سے اس کے رسول یعنی اس کے پیغام یعنی قرآن شریف کی اطاعت مراد ہے۔

اول: سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اللہ کی اطاعت کوئی ایسا مبہم امر تھا کہ اس کی تفسیر کی

ضرورت پیش آتی؟ اللہ کی اطاعت ایک ایسا صاف اور سیدھا جملہ ہے کہ موٹی سے موٹی عقل کے انسان کو بھی اس کے سمجھنے میں کوئی دقت نظر نہیں آتی۔ کسی کی اطاعت یہ ہے کہ جو وہ حکم دے وہ مان لیا جائے۔ جس امر کی تفسیر کی ضرورت نہ ہو اس کی تفسیر قرآن شریف کرنے لگے۔ یہ عجیب معاملہ ہے اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ قرآن شریف اب ساری لغت کو بھی خود بیان کرے۔ کوئی شخص جس کے دل میں قرآن کی عظمت ہے اس بات کو قبول نہیں کرسکتا کہ ایک جملہ جس کے معنی سمجھنے میں کسی کو دقت نظر نہیں آتی اس کی تفسیر خود قرآن شریف کرے۔

دوسرا: سوال یہ ہے کہ تفسیر تو ایک آدھ دفعہ کردینا کافی تھا اس کے کیا معنی کہ جب ﴿اَطِیْعُوا اللّٰہَ﴾ کا حکم دیا ساتھ ہی تفسیر بھی شروع کردی؟ اس سے تو معلوم ہوا کہ یہ کوئی ایسا گول مول فقرہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کی تفسیر نہ کرتا تو شاید لوگ اس کے کچھ کے کچھ معنی سمجھ لیتے۔ اس لیے ایک دو دفعہ تفسیر کردینا کافی نہیں سمجھا بلکہ برابر سالوں تک جب ﴿اَطِیْعُوا اللّٰہَ﴾ کا حکم دیا ساتھ ہی اس کی تفسیر شروع کردی۔ کیا اس کی کوئی اور مثال بھی قرآن شریف میں ہے کہ بار بار جب ایک حکم دیا جائے تو ساتھ ہی اس کی تفسیر بھی بتادی جائے اور کبھی بھی اس کو بغیر تفسیر کے بیان نہ کیا جائے۔

تیسرا: سوال یہ ہے کہ تفسیر ہمیشہ ایسے لفظ سے کی جاتی ہے جو پہلے لفظ کے ابہام کو دور

کر دے اور ابہام کو دور کرنے کا نام ہی تفسیر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بقول مولوی عبداللہ صاحب اللہ کی اطاعت کا مفہوم مبہم ہے اور رسول کی اطاعت کے لفظ نے اسے واضح کر دیا۔ گویا اللہ کے لفظ میں ابہام ہے۔۔۔۔۔۔۔ اور رسول کے لفظ میں نہ صرف کوئی ابہام نہیں بلکہ وہ اس قدر واضح ہے کہ جو ابہام اللہ کے لفظ میں تھا اس نے اسے بھی دور کر دیا۔ اور دوسری طرف مولوی صاحب کی ساری بحث کا دارومدار اس بات پر ہے کہ لفظ رسول کے دو معنی لغت عرب میں آتے ہیں۔ یعنی ایک پیغامبر دوسرے پیغام۔ تو جس لفظ کے دو معنی ہو سکتے ہیں یقیناً اس میں ابہام ہے۔ اس کے خلاف اللہ کے دو معنی آج تک تو روئے زمین پر کسی نے کئے نہیں۔ اب شاید اہل قرآن میں سے کوئی اپنے پیش رو کی عزت بچانے کے لیے کر دے تو کر دے۔ تو پس یوں کہنا چاہئے کہ لفظ اللہ کی تفسیر جس کے معنی ایک کے سوا دوسرے ہو ہی نہیں سکتے اور نہ کبھی کسی نے فرضی طور پر بھی کئے ہیں۔ قرآن شریف نے جسے پُرحکمت کتاب ہونے کا دعویٰ ہے ایک ایسے لفظ سے کی ہے جس کے معنی میں اتنا بڑا ابہام ہے کہ تیرہ سو سال تک سارے مفسرین اور سارے کے سارے علماء ولغت دان اس کے غلط معنی مراد لیتے رہے۔ اور تیرہ سو سال میں اس امت میں سے ایک شخص کو بھی صحیح معنی معلوم نہ ہوئے۔

اگر کوئی غور کرے تو یہ ایک بات ہی ساری بحث کا فیصلہ کرنے کے لیے کافی ہے۔

اس کے متعلق ایک جگہ مولوی عبداللہ صاحب نے کمال ہی کر دیا۔ ایک جگہ تو قرآن شریف میں آتا ہے:﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ﴾[النساء: 61:4]''اور جب ان کو(یعنی منافقوں کو) کہا جاتا ہے آؤ اس کی طرف جو اللہ نے اتارا اور رسول کی طرف۔'' مولوی صاحب یوں ترجمہ کرتے ہیں:''جب کہا جائے ان کو آؤ اس کتاب اللہ کی طرف جو اتاری ہے اللہ تعالیٰ نے یعنی اس کے بھیجے ہوئے قرآن مجید کی طرف'' گویا﴿مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ سے تو ان کو پتہ نہ لگتا تھا کہ خدا تعالیٰ کس چیز کی طرف بلاتا ہے؟ لیکن الرَّسُوْل سے اس کی تفسیر ہوگئی۔ کوئی خدا کے لیے غور کرے کہ یہ کیا ہنسی قرآن شریف کے ساتھ ہو رہی ہے؟ کہ ﴿مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ ایسے صاف واضح لفظ کی بھی تفسیر کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور بہر حال ضرورت پیش آئی تھی تو کوئی اس سے بھی زیادہ واضح جملہ بولا جاتا۔ مگر﴿مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ کی تفسیر جس کے معنی ساری امت محمدیہ میں مولوی عبداللہ صاحب کے ہم خیالوں سمیت مسلم طور پر ایک ہی ہیں اور ایک ہی ہمیشہ رہے ہیں الرَّسُوْل سے کی جاتی ہے جس کے معنی میں بقول مولوی صاحب ابہام ہے۔ الٹے عقیدہ کے ماتحت انسان کے دماغ میں خیال بھی الٹے آنے لگتے ہیں۔ واضح ترین اور روشن ترین ایک ہی معنے کے لفظ کی تشریح مبہم اور ذو معنی الفاظ سے کرنا انہی الٹے خیالات کا نتیجہ ہے۔

مگر ہم اس تفسیری 'و' کے کمالات کو ذرا اور غور سے دیکھتے ہیں ﴿اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ میں تو اللہ کی تفسیر لفظ رسول سے ہوتی ہے اور ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ﴾ میں

ایک جملہ ﴿فَاتَّقُوا اللّٰہَ﴾یعنی اللہ کا تقویٰ کرو کی تفسیر دوسرے جملہ ﴿وَاَطِیْعُوْنِ﴾ سے ہوتی ہے۔یعنی میری اطاعت کرو یا بقول مولوی صاحب میری موافقت کرو یعنی جس طرح میں تقویٰ کرتا ہوں اسی طرح تم تقویٰ کرو۔ یہاں بھی وہی صورت ہے ﴿فَاتَّقُوا اللّٰہَ﴾ کے معنی تو ایک ہی ہیں کیونکہ اس جملہ میں دونوں لفظ یعنی اتقا اور اللہ ایک ایک معنی کے ہی متحمل ہیں۔لیکن اطاعت کے پھر دو معنی ہیں۔ایک حکم کا ماننا دوسرے بقول مولوی صاحب چال چلن میں موافقت اختیار کرنا۔ یہاں پھر واضح لفظ کی تفسیر مبہم سے ہوئی۔ کیونکہ ایک معنی والے لفظ کے مقابل میں دو معنی والے لفظ میں کچھ نہ کچھ ابہام ضرور ہے۔تیسرا جملہ اس قسم کا ﴿فَاتَّبِعُوْنِیْ وَ اَطِیْعُوْٓا اَمْرِیْ﴾ ہے۔ یہاں بھی 'و' تفسیری بتائی جاتی ہے۔گویا ﴿فَاتَّبِعُوْنِیْ﴾ کے معنی میں کچھ اختلاف تھا اس کو واضح کر دیا کہ اس سے مراد ہے ﴿وَاَطِیْعُوْٓا اَمْرِیْ﴾ مگر اصل یہ ہے کہ ﴿فَاتَّبِعُوْنِیْ﴾ کے معنی میں تو جملہ مفسرین کے ساتھ مولوی عبداللہ صاحب کو کوئی اختلاف نہیں۔اور ﴿اَطِیْعُوْٓا اَمْرِیْ﴾ میں اختلاف ہے۔ جملہ مفسرین ﴿اَطِیْعُوْٓا اَمْرِیْ﴾ کے معنی کرتے ہیں: ''میرے حکم کی فرمانبرداری کرو۔'' مگر مولوی عبداللہ صاحب اس کے معنی کرتے ہیں میرے چال چلن میں میری موافقت کرو۔ پھر وہی قضیہ درپیش ہے کہ جس لفظ کے معنی میں کچھ اختلاف نہیں اس کی تفسیر ایسے لفظ سے کی جاتی ہے جس کے معنی میں اختلاف ہے۔اگر مولوی عبداللہ صاحب یہ ثابت کر دیتے کہ ﴿اَطِیْعُوْٓا﴾ کے وہ معنی ہی از روئے لغت غلط ہیں جو عام مفسرین کرتے آئے ہیں تو ان کی بات بے شک قابل قبول ہوتی۔مگر جب وہ معنی

بھی صحیح ہیں اور مولوی عبداللہ صاحب والے بھی صحیح تو بہرحال معنی میں ابہام ہوا۔ گویا تینوں مثالوں میں یعنی ﴿اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ الرَّسُوۡلَ﴾ میں ۔﴿فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوۡنِ﴿۵۰﴾﴾ میں ﴿فَاتَّبِعُوۡنِیۡ وَ اَطِیۡعُوۡۤا اَمۡرِیۡ﴾ میں تین واضح المعنی الفاظ اللہ، اتقاء اللہ اور اتباع کی تفسیر تین مبہم الفاظ الرَّسُوۡلَ، اَطِیۡعُوۡنِ اور اَطِیۡعُوۡۤا اَمۡرِیۡ سے کی گئی ہے۔ ایسے لفظ کی تفسیر جس کے معنی میں کوئی اختلاف نہ ہو ایسے لفظ سے کرنا جس کے معنی میں اختلاف اور ابہام ہے کسی عقلمند کا کام نہیں۔

تفسیری واؤ:

لیکن آؤ ذرا اس واؤ تفسیری پر غور کریں جس نے اتنا بڑا انقلاب دنیا میں پیدا کر دیا کہ ایک اس کی مہربانی سے تمام مجموعہ احادیث، تمام اقوال و افعال نبوی نعوذ باللہ ایک ہزلیات کا مجموعہ بن گیا اور تیرہ سو سال کے سارے علوم اسلامی جو پاکیزہ سے پاکیزہ قلوب سے نکلے اور جن پر بہترین سے بہترین دماغ لگے رہے وہ تمام باطل ہو گئے۔ یہ کیسی تفسیری واؤ تھی؟ اور تمام آئمہ ومحدثین وعلماء وملہمین ربانی کی آنکھوں سے کس طرح یکسر چھپی رہی؟ اور کیا آئمہ لغت اور آئمہ صرف ونحو کو بھی اس کا کوئی علم ہوا تھا یا نہیں؟ یا وہ بھی اس سے بے خبر رہے؟ واؤ عطف کے لیے آتی ہے اس عطف کے اقسام لکھتے ہوئے مغنی اللبیب میں لکھا ہے کہ ایک عطف کسی شے کا اپنے ہم معنی پر ہوتا ہے۔ وَالثَّالِثُ عَشَرَ عَطْفُ الشَّیْءِ عَلٰی مُرَادِفِہٖ اور اس کی مثالیں دی ہیں:

﴿اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ﴾، ﴿اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ﴾، ﴿لَا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا﴾ یہاں گویا لفظ بَثّ اور حُزْن، صَلَوَاتٌ اور رَحْمَةٌ، عِوَجٌ اور اَمْتٌ مرادف یعنی ہم معنی لفظ ہیں۔ تو گویا یہ جائز ہے کہ ایک لفظ پر دوسرے لفظ ہم معنی لفظ کو مزید تاکید کے لیے عطف کر دیا جائے۔ اب ﴿اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ﴾ میں الرَّسُوْلَ کا عطف اللہ پر ہے تو کیا اللہ اور الرسول دو مرادف لفظ ہیں؟ (الرَّسُوْلَ کے دونوں معنی میں سے جو چاہو لے لو) یا ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ﴾ میں آیا ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اور ﴿اَطِيْعُوْنِ﴾ دو مرادف جملے ہیں۔ پس یہ تفسیری واؤ زبردستی کی بنائی گئی ہے۔ مرادف یعنی ہم معنی لفظ ایک دوسرے پر عطف ہو سکتے ہیں۔ مگر اللہ اور اس کی رسالت ہم معنی نہیں ہیں۔ پس یہ بنیاد جس پر یہ عمارت کھڑی کی گئی ہے خود غلط ہے۔ اور جو عمارت اس پر کھڑی ہوئی ہے اس کا حال پہلے واضح ہو چکا۔ واؤ تفسیری جس پر مولوی عبداللہ اور ان کے ہم خیالوں کی ساری بحث کا دارومدار ہے خود ان کی تجویز کردہ ہے۔ آئمہ لغت و آئمہ نحو کو اس کا کوئی علم نہیں۔

وحی خفی کا ذکر قرآن شریف میں:

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حدیث کو وحی خفی نہیں کہنا چاہئے۔ حالانکہ اس وحی کا ذکر خود قرآن شریف کرتا ہے۔ کیونکہ جب یہ فرمایا کہ ﴿اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝۱۹﴾ تو جو کچھ نبی کریم ﷺ نے مسائل کے بارہ میں فرمایا اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف ہی منسوب کیا۔

جس طرح جمع قرآن کو اپنی طرف منسوب کیا حالانکہ کوئی وحی آپ پر ایسی تو نازل نہ ہوئی تھی کہ فلاں سورت کو فلاں جگہ رکھو اور فلاں آیت کو فلاں جگہ رکھو۔ پس آپ کا ترتیب سور و آیات دینا بھی خدا کی طرف سے تھا اور بیان مسائل بھی خدا کی طرف سے تھا۔لیکن چونکہ یہ وحی متلو کے ذریعہ سے نہیں ہوا اس لیے اسے وحی خفی کہا جاتا ہے۔

قرآن شریف میں نماز اور وضو کے ذکر سے وحی خفی پر کھلا استدلال:

قرآن شریف میں نماز کا حکم کب نازل ہوا؟ ظاہر ہے کہ نہایت ابتدائی سورتوں میں یہ حکم پایا جاتا ہے۔ سورۂ اقرأ میں، سورہ مزمل میں اور دوسری ابتدائی سورتوں میں اور تاریخ سے بھی یہی شہادت ملتی ہے۔ پس اگر نماز کی تفصیلات کے بیان کرنے کی ضرورت تھی اور نبی کریم ﷺ وحی خفی کے ذریعہ سے ان تفصیلات کے بتانے کے مجاز نہ تھے تو چاہئے تھا کہ ان تمام تفصیلات کے جو نماز کے متعلق قرآن شریف میں بتائی جاتی ہیں نازل ہونے کے بعد نماز پڑھنے کا حکم دیا جاتا اور ایسا ہی وضو کی تفصیل بھی پہلے نازل ہو لیتی۔لیکن جو شخص مولوی عبداللہ صاحب کی تشریحات کو پڑھے گا وہ صاف دیکھ سکتا ہے کہ مولوی عبداللہ صاحب نے ان آیات سے نماز کی تفصیلات کا استدلال کیا ہے جو نماز کے حکم کے مدتوں بعد نازل ہوئیں۔اور ایسا ہی آج مولوی صاحب کے مرید کرتے ہیں۔ یہ عجیب تفصیل ہے کہ حکم تو نماز پڑھنے کا پہلے دے دیا اور تفصیلات سالہا سال بعد بیان کیں۔کیا کوئی عقلمند اس کو قبول کرسکتا ہے؟ یا خدا کی طرف ایسی بات منسوب کرسکتا

ہے؟ ہاں یوں کہنا چاہئے کہ جب قرآن کریم نے بعد میں نازل ہوکر نماز کے اوقات وغیرہ کا بھی بعض حالات میں ذکر کردیا تو گویا جو کچھ نبی کریم ﷺ نے وحی خفی سے اوقات یا ارکان مقرر فرمائے تھے ان کی صحت کو تسلیم کرلیا۔

ایسا ہی وضو کی تفصیل کہ نماز سے پیشتر منہ اور کہنیوں تک ہاتھ اور ٹخنوں تک پاؤں دھوؤ اور سر کا مسح کرو۔ سورہ مائدہ میں ہے جو بہت پچھلے زمانہ میں مدینہ میں آکر نازل ہوئی۔ حالانکہ وضو تو شروع سے کیا جاتا تھا۔ اس میں یہی بتایا گیا ہے کہ جو صورت وضو کی نبی کریم ﷺ نے بتائی تھی وہی درست ہے اور وحی متلو کا اس کو اپنے اندر لے لینا بتاتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے وضو اپنی رائے سے مقرر نہ کیا تھا بلکہ وحی خفی سے وضو کو ضروری ٹھہرایا اور وحی خفی سے ہی اس کی تفصیلات بتائیں۔ یہ وحی خفی پر قرآن کریم سے ایسا کھلا استدلال ہے جس کو مسلمان کہلا کر کوئی شخص رد نہیں کرسکتا۔

وحی کے تین رنگ:

خود بشر کے ساتھ وحی کے تین رنگوں کا ذکر قرآن شریف میں موجود ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ﴾ [الشوریٰ:51:42]

''اور نہیں شایان کسی بشر کو کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ کلام کرے مگر وحی سے یا پردہ کے پیچھے سے یا رسول بھیجے۔ پس اپنے اذن سے جو چاہے وحی کرے۔''

یہاں خاص بشر کے ساتھ کلام کرنے کا ذکر ہے۔ اس لیے وہ لوگ اس میں شامل نہیں ہو سکتے جن کی طرف رسول بھیجے جاتے ہیں۔ مگر خود ان کے ساتھ کلام نہیں ہوتا جیسا کہ ان کا اپنا قول قرآن شریف میں منقول ہے ﴿لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ﴾ ''اللہ ہمارے ساتھ کیوں کلام نہیں کرتا؟'' مولوی عبداللہ صاحب نے یہاں پر غلطی کھائی ہے اور جن لوگوں کی طرف رسول بھیجے گئے ان کے ساتھ بھی خدا کا کلام کرنا مانا ہے۔ حالانکہ قرآن شریف اس کا انکار کرتا ہے۔ پس یہاں خاص بشر کے ساتھ کلام کا ذکر ہے اور اس کی تین طرزیں بتائیں۔

سب سے اوّل خود لفظ وحی کو رکھا ہے جس کے اصل معنی ہیں اشارہ سریعہ یعنی تیز اشارہ اور یہ کسی بات کے دل میں ڈالنے کا نام ہے۔ جیسا کہ امام راغب نے لکھا ہے إِلْقَآءٌ فِي الرَّوْعِ. پس یہ بھی ایک طرز کلام ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی خاص بندے کے دل میں ایک بات ڈال دے۔ اس کے مقابل پر شیطانوں کے اپنے ساتھیوں کو وحی کرنے کا ذکر ہے ﴿وَإِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ إِلٰٓى أَوْلِيٰٓئِهِمْ﴾ [الانعام: 6:121] ''شیطان اپنے ساتھیوں کی طرف وحی کرتے ہیں۔'' حالانکہ شیطان بھی الفاظ کی وحی نہیں کرتے بلکہ دل میں ایک بات ڈالتے ہیں۔ ﴿الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ﴾۔ سو دل میں ڈالنا ہی وحی خفی ہے۔ کیونکہ بمقابلہ الفاظ والی وحی کے اس کا رنگ مخفی ہے۔

دوسرا طریق کلام کا اللہ تعالیٰ نے ﴿مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ﴾ فرمایا ہے۔ جیسا کہ رؤیا میں ہوتا ہے۔ کیونکہ رؤیا میں ایک پردہ ہوتا ہے اور وہ تعبیر طلب ہوتی ہے۔ ایسا ہی وہ کلام یا آواز جو انسان سنتا ہے یا وہ الفاظ جو اس کی زبان پر جاری ہوتے ہیں جس پر تمام اولیائے امت کی متفقہ شہادت ہے اور خود نبی کریم ﷺ کی رؤیا کا ذکر قرآن شریف میں موجود ہے۔ ﴿لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ﴾ [الفتح: 48:27] ''اللہ نے اپنے رسول کو رؤیا سچ دکھایا تھا'' اور گو اصل رؤیا کو قرآن شریف میں بیان نہیں کیا مگر اس کی تعبیر کو بیان کیا ہے: ﴿لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ﴾ ''تم ضرور مسجد حرام میں داخل ہوگے۔'' یعنی وہ خواب اس طرح پورا ہو کر رہے گا۔ پس رؤیا اور الہام بھی اللہ تعالیٰ کے کلام کی ایک قسم ہے جس کو ﴿مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ﴾ کہا ہے۔

تیسری قسم وہ ہے جو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ خاص ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ ملک رسول یعنی جبریل کو بھیجتا ہے: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ﴾ [الشعراء: 26:193-194] اور دوسری جگہ ہے: ﴿قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ [البقرۃ: 2:97] ''کہو جو شخص جبریل کا دشمن ہے تو اسی (جبریل) نے اسے (یعنی قرآن کو) تیرے دل پر اتارا اللہ کے اذن سے۔'' یہاں اِنَّهٗ کی ضمیر جبریل کی طرف ہی جاتی ہے جو قریب تر ہے۔ اور بِاِذْنِ اللّٰهِ میں اللہ کا لفظ صراحتاً لانا بھی یہی ثابت کرتا ہے۔ ورنہ صورت عبارت یوں ہونی چاہئے تھے فَاِنَّ اللّٰهَ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِهٖ۔ پس قسم اول جس کو صرف وحی کہا ہے وہ درحقیقت وحی خفی ہے جس میں

صرف دل میں ایک بات ڈالی جاتی ہے۔

وحی خفی پر دو اعتراض:

اوّل: آنحضرت ﷺ سے وقوع سہو یا غلطی:

یہاں پر دو سوال کیے جاتے ہیں ایک یہ کہ اگر وحی خفی کوئی چیز ہے تو باوجود وحی خفی کے رسول اللہ ﷺ سے کسی موقعہ پر سہو یا نسیان یا غلطی کیوں ہوئی؟ اور دوسرے یہ کہ پھر اس وحی خفی کو کامل طور پر محفوظ رکھنے کا کوئی انتظام اللہ تعالیٰ نے کیوں نہ کیا؟ جیسا کہ قرآن کریم کی حفاظت کا انتظام کیا۔

ان دونوں سوالوں کا جواب یوں بھی ہوسکتا ہے کہ وحی متلو اور وحی خفی کے مرتبہ میں فرق دکھانے کے لیے ایسا کیا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ آنحضرت ﷺ کا سہو وغیرہ بھی امت کی تعلیم کے لیے تھا۔ لیکن کسی مسئلہ کے بیان کرنے میں آنحضرت ﷺ کو کبھی غلطی نہیں لگی۔ البتہ بعض دوسری باتوں میں غلطی لگی کیونکہ آخر آپ بشر تھے۔ اور بتقاضائے بشریت کسی وقت غلطی لگ جانا یا سہو ہوجانا نبوت کے منافی نہیں۔ ہاں اگر آپ مسائل غلط بیان کرنا شروع کردیں جیسا کہ مولوی عبداللہ صاحب کا خیال ہے تو پھر تو شریعت سے امن اٹھ جاتا ہے اور جن مواقع پر آپ کو غلطی لگی یا سہو ہوا اس میں بھی درحقیقت امت کی تعلیم ہے اور بڑے بڑے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک رؤیا کی تعبیر میں غلطی لگی جیسا کہ ابھی حدیبیہ والا رؤیا بیان ہوا حالانکہ رؤیا سچ تھا مگر رؤیا میں یہ نہ تھا کہ

اس سال آپ حج کریں گے۔ واپس ہونا پڑا مگر اس سے تو اس قدر نیک نتائج پیدا ہوئے کہ جن کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔ مجملاً دیکھئے یہ صلح فتح مبین ثابت ہوئی۔ اس کے بعد ہزاروں کی تعداد میں لوگ اسلام میں داخل ہوئے۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے وقت آپ کے ساتھ تیرہ سو یا پندرہ سو آدمی ہیں۔ ڈیڑھ سال بعد فتح مکہ کے وقت دس ہزار ہیں۔ پھر صلح کرا کر یہ بتا دیا کہ یہ اسلام کا حکم نہیں کہ جب تک سب مسلمان نہ ہوں جنگ کرتے جاؤ۔ اگر ایسا حکم ہوتا تو نبی کریم ﷺ کفار کے ساتھ کبھی صلح نہ کرتے۔ پھر شرائط صلح میں یہ شرط لکھی گئی کہ مسلمانوں میں سے کوئی کفار کے ساتھ جا ملے تو اسے واپس نہیں کریں گے اور کوئی کافر مسلمان ہو کر آنحضرت ﷺ کے پاس آئے تو آپ اسے واپس کر دیں گے۔ اب مسلمانوں میں سے ایک کا بھی کفار کے ساتھ جا ملنا ثابت نہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ وہ بزور شمشیر مسلمان نہ ہوئے تھے۔ ورنہ سب کے سب فوراً کفار کے ساتھ جا ملتے اور کفار قریش میں سے جو لوگ مدینہ میں آنحضرت ﷺ کے پاس آئے آپ نے انہیں واپس کیا اور یوں پابندی معاہدہ کر کے سبق دیا۔ پھر جو لوگ واپس ہوئے وہ اس قدر اخلاص اسلام کے ساتھ رکھتے تھے کہ مکہ واپس نہیں گئے۔ بلکہ الگ جا کر اپنی ایک آبادی بنالی جہاں آہستہ آہستہ ایک خاصی جماعت بن گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی کشش کس قدر غالب تھی کہ حالانکہ مسلمان بھی اپنے ساتھ نہیں ملاتے پھر بھی کفار میں واپس نہیں گئے۔ اس نے دو باتوں پر مہر لگا دی؛ اول ان کے دلوں میں دنیوی لالچ ذرہ بھر نہ تھا۔ دوم ان کا اخلاص ایک پہاڑ کی طرح تھا جس کو کوئی دکھ اور فتنہ جنبش نہیں دے سکتا تھا۔ پس یہ غلطی بھی امت کے لیے بہت سے فوائد کا موجب ہوئی۔ مثلاً آپ نے

ایک موقعہ پر اپنی کسی بیوی کی خوشی کے لیے کسی چیز کو ترک کر دیا تو یہ کوئی مسئلہ نہیں جو غلط بیان کر دیا ہو۔ بلکہ آپ نے اپنی ذات کے لیے ایک چیز کو جس سے آپ کو محبت تھی ترک کر دیا اور یہ حسن معاشرت میں ایک سبق تھا بایں یہ درست نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس غلطی پر متنبہ کر دیا۔ یہ غلطی کرا کر متنبہ کرنا اس لیے تھا تا کہ امت کو یہ بات ذہن نشین ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں کو ارادۃً ترک کر دینا درست نہیں۔ یا مثلاً ایک نابینا کے اس وقت آنے پر جب آپ بعض کفار کو سمجھا رہے تھے اور اس کے آپ کو اپنی طرف متوجہ کرنے پر آپ کی پیشانی پر بل آ جانا۔ حالانکہ محض ایک تقاضائے بشریت ہے اور نابینا پیشانی کے بل کو دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ مگر چونکہ آپ کو اعلیٰ اخلاق پر قائم کرنا اور آپ کی امت کو ایک سبق دینا تھا اس لیے فرمایا: ﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ۝١ اَنْ جَاۗءَهُ الْاَعْمٰى ۝٢﴾ [عبس: 80:1-2] تو گو یہ نہایت ہلکی فروگزاشت تھی مگر یہ بھی اس لیے ہوئی تا کہ مخالفوں پر اتمام حجت ہو کہ یہ وحی رسول کے دل سے پیدا نہیں ہوتی۔ کیونکہ اگر خود بنانے والا ہوتا تو اپنی کمزوری کی تشہیر کیوں دنیا میں کرتا۔ غرض وہ تمام امور جن میں آپ سے فروگزاشت یا سہو ہوا وہ مسائل دینی کے بیان کرنے میں تو ہرگز نہیں ہوا اور وحی خفی کی روشنی مسائل کے بیان کرنے سے ہی مخصوص ہے۔ جیسا کہ ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ سے ثابت ہے۔ البتہ ان فروگزاشتوں اور سہو سے بڑی عظیم الشان باتیں اخذ ہوتی ہیں۔

دوم: وحی خفی کی حفاظت قرآن شریف کی طرح کیوں نہ ہوئی؟

رہا یہ سوال کہ حدیث اس طرح پر محفوظ کیوں نہ رہی جس طرح قرآن شریف؟

میں پوچھتا ہوں کہ توریت وانجیل اوراور کتب منزلہ اس طرح پر کیوں محفوظ نہ رہیں جس طرح پر قرآن شریف محفوظ رہا؟ حالانکہ وہ تو وحی متلو تھی۔ مثلاً انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تھوڑی دیر بعد ہی محرف نظر آتی ہے۔ حالانکہ اس پر عملدرآمد تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ تک ضروری تھا۔ اوراب بھی وہ محرف نہ ہوتی تو عیسائیوں پر اتمام حجت کیسا آسان ہوتا؟ لیکن میں اگلے مضمون میں دکھاؤں گا کہ حدیث کی حفاظت کے سامان اللہ تعالیٰ نے کس قدر کیے اور وحی خفی ہونے کے باوجود تورات وانجیل سے جو وحی متلو ہیں بہت زیادہ محفوظ ہے۔

چوتھا باب

جمع حدیث

جمع حدیث پر اعتراض:

ضرورت حدیث کے مضمون کو بیان کرنے کے بعد دوسرا مرحلہ ہماری راہ میں یہ ہے کہ آیا اس وقت سے پہلے جب محدثین نے احادیث کو کتابوں میں مدون کیا کوئی سامان حفاظت حدیث کا تھا یا نہیں؟ کیونکہ خواہ محدثین نے کتنا بھی نیک نیتی سے کام لیا ہو جس کا اعتراف بیرونی اور اندرونی معترضین کو یکساں ہے۔ تاہم ان کی نیک نیتی اور ان کی محنت کسی بڑے مفید نتیجے تک نہیں پہنچا سکتی۔ اگر ابتدائی ایک ڈیڑھ سو سال میں حدیث کی حفاظت نہ کی گئی ہو۔ بیرونی معترضین کا تو یہ خیال ہے کہ حدیث کی ضرورت ابتدائی زمانہ اسلام میں نہ تھی۔ یعنی آنحضرت ﷺ یا مثلاً خلیفہ اوّل اور اوائل زمانہ خلیفہ ثانی میں۔ کیونکہ اس وقت مسلمانوں کی ضروریات کا دائرہ نہایت محدود تھا اور کہ فتوحات اسلامی کے ساتھ اور سلطنت کی وسعت کے ساتھ یہ ضرورت پیش آئی اور حدیثیں بنانی شروع کی گئیں۔ اور اندرونی معترضین کہتے ہیں کہ زمانہ نبوی اور زمانہ صحابہ اور تابعین وغیرہ میں حدیث کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

زمانہ نبوی میں ضرورت حدیث:

سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ آیا حدیث کی ضرورت آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں تھی یا نہیں؟ جو شخص کچھ بھی تاریخ اسلامی پر غور کرنے کی تکلیف گوارا کرے گا اسے معلوم ہوگا کہ شریعت اسلامی کی بنیاد ابتدا سے ہی اولاً قرآن کریم پر اور پھر آنحضرت ﷺ کے قول وفعل پر رکھی گئی۔ مثلاً قرآن کریم ابتدا میں ہی مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ تم نماز پڑھو۔ لیکن نماز کس طرح پڑھنی چاہئے؟ اس کے متعلق کوئی تفصیل قرآن شریف نے نہیں بتائی۔ اور اگر بعد میں کبھی نماز کے بعض ارکان کا ذکر کر بھی دیا ہو تو کم از کم ابتدا میں نماز کے حکم کے ساتھ ہی کوئی تفصیل نہیں بتائی کہ نماز کس طرح پڑھنی چاہئے؟ پس نماز کے متعلق کل کے کل احکام اور اس کے پڑھنے کا طریق خود آنحضرت ﷺ نے سکھایا اور یہی آپ کا سکھانا یعنی عمل سے بتانا کہ نماز یوں پڑھنی چاہئے یا اپنے اقوال سے تشریح کرنا اور اذکار بتانا حدیث ہے۔ ایسا ہی دوسرے احکام قرآنی کے متعلق سمجھ لینا چاہئے۔ پس حدیث کی ضرورت قرآن کریم کے نزول کے ساتھ ہی پیدا ہوئی۔ آنحضرت ﷺ صرف ایک اخلاقی واعظ نہ تھے کہ کچھ مواعیظ آپ پر نازل ہوئے تو آپ نے لوگوں کو وہ سنا چھوڑے۔ بلکہ آپ ابتدا سے ہی ایک شارع تھے اور اپنی قوم کو ایک خاص راہ پر چلانے اور ان کے تعلقات باللہ اور تعلقات انسانی میں ان کو تعلیم دینا، یہ شروع سے ہی آپ کا کام تھا۔ آپ کا ہر ایک قول اور فعل صحابہ کے لیے ان کی زندگیوں کا سب سے قیمتی ذخیرہ تھا۔ خود قرآن کریم میں کس قدر زور سے اور

بار بار رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور آپ کے ہر ایک حکم کو بجالانے کی تاکید کی گئی ہے۔ یہ پچھلے باب میں بیان ہو چکا ہے اس لیے میں ان آیات کو دہرانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ وہ آیات بھی اس کے ساتھ ہی قابل غور ہیں جن میں آنحضرت ﷺ کو اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا ہے اور آپ کے پاک اخلاق کو ظاہر کیا گیا ہے۔ کیونکہ ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس قدر صحابہ رضی اللہ عنہم آپ کے اقوال و افعال کے رنگ میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہوں گے؟

حفاظت حدیث کے لیے آنحضرت ﷺ کا خود تاکید کرنا:

اب ہم حدیث پر غور کرتے ہیں کہ آیا حدیث میں اندرونی شہادت اس امر کی موجود ہے یا نہیں کہ اس کی حفاظت کے سامان آنحضرت ﷺ نے یا صحابہ رضی اللہ عنہم نے کوئی کئے یا نہیں؟ سو اوّل یہ دیکھنا چاہئے کہ آنحضرت ﷺ نے خود اپنے احکام کے متعلق کیا تعلیم دی ہے؟ کِتَابُ الْعِلْمِ میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ حدیث بیان کی ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے ہے کہ جب قوم عبدالقیس کا وفد آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہمارے اور آپ کے درمیان کفار ہیں۔ یعنی ہمارا راستہ ان کے درمیان میں سے ہے۔ پس ہم آپ کی خدمت میں سوائے حرمت والے مہینوں کے حاضر نہیں ہو سکتے۔ تو آپ نے نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ کے احکام بیان فرمانے کے بعد ان کو فرمایا:

[احْفَظُوهُ وَأَخْبِرُوهُ مَنْ وَرَآءَكُمْ]

یعنی ''خود ان باتوں کو خوب محفوظ رکھو۔ (یعنی اچھی طرح سے یاد کرلو) اور جو لوگ تمہارے پیچھے رہ گئے ہیں ان کو یہ باتیں (صحیح صحیح) پہنچادو۔''

یہاں آنحضرت ﷺ خود حفاظت حدیث کا اور اس کو صحیح صحیح دوسروں تک پہنچانے کا حکم دیتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور کیا واضح ثبوت ہوسکتا ہے؟

ایسا ہی مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

[قَالَ لَنَا النَّبِيُّ ﷺ: "ارْجِعُوا إِلَى أَهْلِيكُمْ فَعَلِّمُوهُمْ".]

یعنی آنحضرت ﷺ نے ہم کو یہ حکم دیا کہ ''اپنے گھروں میں واپس چلے جاؤ اور اپنے لوگوں کو (یہ باتیں جو میں نے تمہیں سکھائی ہیں) سکھاؤ۔''

یہ بھی پہلی حدیث کی مؤید ہے۔ یہ بھی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی نیا قبیلہ یا قوم ایمان لاتی تھی تو آنحضرت ﷺ اپنے صحابہ میں سے ایک شخص کو ان کی طرف بھیج دیا کرتے تھے تاکہ وہ انہیں ان کے درمیان رہ کر احکام دین سکھادے اور پوری طرح سے دین اسلام اور اس کی شریعت سے باخبر کرے۔ ایسے لوگ ان نومسلموں کو نہ صرف قرآن کریم سکھانے کے لیے بھیجے جاتے تھے بلکہ اس غرض سے کہ ان کو سکھائیں کہ کس طرح احکام دین کی پیروی کرنی چاہئے۔ ایسے لوگ لازماً خود ایسے ہوتے تھے جو قرآن کریم کے علاوہ آنحضرت ﷺ کے اقوال و افعال سے بھی اچھی طرح واقف

ہوں۔ تا کہ ان لوگوں کو جن کی طرف وہ بھیجے جاتے تھے احکام دین اور آنحضرت ﷺ کا طرز عمل سکھا دیں۔ پس نہ صرف آنحضرت ﷺ کی طرف سے یہ تاکیدی حکم تھا کہ آپ کے اقوال کو یاد رکھا جائے اور دوسروں کو صحیح صحیح پہنچایا جائے۔ بلکہ مختلف اقوام میں جو وقتاً فوقتاً اسلام میں داخل ہوتی تھیں آپ کا واعظین کو بھیجنا (تا کہ وہ ان کو احکام دین سکھا دیں) اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ آپ نے اپنی زندگی میں ہی اس پر عمل بھی کروا دیا۔ اور چونکہ واعظین جو اِن نئی اسلام میں داخل ہوئی ہوئی قوموں کی طرف بھیجے جاتے تھے جو کچھ ان لوگوں کو آنحضرت ﷺ کے اقوال و افعال کے متعلق بتاتے تھے ان کو خود بھی یہ موقعہ ملتا تھا کہ براہ راست آنحضرت ﷺ سے اس کی تصدیق کر لیں۔ اس لیے ایسی احادیث ہر قسم کی غلطی اور آمیزش سے خالی تھیں۔ کیونکہ ایسے وقت میں جب چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی آنحضرت ﷺ کے حضور میں وہ لوگ عرض کیا کرتے تھے یہاں تک کہ آپ نے ایک امام مقرر کیا تو اس کے متعلق یہ شکایت آپ کے سامنے آئی کہ یہ قراءت لمبی پڑھتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ ہرگز قرین قیاس نہیں کہ ان احادیث میں جو اسی زمانہ میں آنحضرت ﷺ کی موجودگی میں ہی دوسروں تک پہنچنی شروع ہوگئی تھیں کسی قسم کا تصرف ہوا ہو۔ پس آنحضرت ﷺ کا خود واعظین کو مختلف اقوام کے اندر بھیجنا تا کہ وہ ان کو دین حق سے اور آپ کے حالات سے آگاہ کریں۔ یہ حدیث کی حفاظت کے سامانوں میں سے پہلا سامان تھا۔

اوپر میں یہ بھی دکھا چکا ہوں کہ جب ایک قوم آپ کے سامنے آتی تو آپ ان کو

چند احکام دین سکھانے کے بعد یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ ''ان کو یاد رکھو اور اپنے لوگوں کو ان سے آگاہ کرو۔'' اور کئی احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ حدیث کو صحت کے ساتھ دوسروں تک پہنچانے کے لیے ہمیشہ بہت تاکید فرمایا کرتے تھے۔ ترمذی اور ابن ماجہ نے یہ حدیث بیان کی ہے:

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ: "نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مِنَّا شَيْئًا فَبَلَّغَهُ كَمَا سَمِعَ فَرُبَّ مُبَلَّغٍ أَوْعٰى لَهُ مِنْ سَامِعٍ". [جامع الترمذي: 2657]

یعنی ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سنا فرماتے تھے کہ ''اللہ تعالیٰ اس آدمی کو سرسبز کرے جس نے ہم سے کوئی بات سنی پھر جس طرح اس کو سنا بعینہٖ اسی طرح اس کو دوسروں کو پہنچایا۔ کیونکہ بعض وہ لوگ جن کو باتیں پہنچائی جاتی ہیں اصل سننے والوں سے اس بات کو زیادہ محفوظ رکھنے والے ہوتے ہیں۔''

ایسا ہی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ بھی اس مضمون کی ایک حدیث بیان کرتے ہیں:

عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ أَبِي بَكْرَةَ عَنْ أَبِيهِ ذَكَرَ النَّبِيَّ ﷺ قَعَدَ عَلٰى بَعِيرِهِ، وَأَمْسَكَ إِنْسَانٌ بِخِطَامِهِ -أَوْ بِزِمَامِهِ- قَالَ: "أَيُّ يَوْمٍ هٰذَا؟" فَسَكَتْنَا حَتّٰى ظَنَنَّا أَنَّهُ

سَيُسَمِّيهِ سِوَى اسْمِهِ. قَالَ: "أَلَيْسَ يَوْمَ النَّحْرِ؟" قُلْنَا: بَلٰى. قَالَ: "فَأَيُّ شَهْرٍ هٰذَا؟" فَسَكَتْنَا حَتّٰى ظَنَنَّا أَنَّهُ سَيُسَمِّيهِ بِغَيْرِ اسْمِهِ. فَقَالَ: "أَلَيْسَ بِذِي الْحِجَّةِ؟" قُلْنَا: بَلٰى. قَالَ: "فَإِنَّ دِمَآءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ وَأَعْرَاضَكُمْ بَيْنَكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا، فِي شَهْرِكُمْ هٰذَا، فِي بَلَدِكُمْ هٰذَا. لِيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَآئِبَ، فَإِنَّ الشَّاهِدَ عَسٰى أَنْ يُّبَلِّغَ مَنْ هُوَ أَوْعٰى لَهُ مِنْهُ". [صحيح البخاري: 67]

یعنی آنحضرت ﷺ اونٹ پر سوار تھے اور ایک آدمی نے مہار پکڑی ہوئی تھی۔ آپ نے سوال کیا ''یہ کون سا دن ہے؟'' ہم خاموش رہے۔ یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ آپ اس کا کوئی جدید نام بتائیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا یہ یوم النحر نہیں؟'' (یعنی ذوالحج کی دسویں تاریخ۔) ہم نے عرض کیا ہاں۔ پھر آپ ﷺ نے سوال کیا کہ ''یہ کون سا مہینہ ہے؟'' ہم خاموش رہے یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ آپ اس کا کوئی اور نام بتائیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا یہ ذوالحج کا مہینہ نہیں ہے؟'' ہم نے عرض کیا ہاں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''تمہارے خون اور تمہارا مال اور تمہاری عزت تمہارے درمیان ان سب کو وہی حرمت حاصل ہے جو تمہارے اس شہر میں اس مہینے کے اندر اس دن کو حاصل

ہے۔ چاہئے کہ جو حاضر ہے وہ غائب کو میری بات پہنچا دے۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ ایسے شخص کو خبر پہنچا دے جو شاہد کی نسبت بات کو زیادہ محفوظ رکھنے والا ہے۔''

آخری حصہ حدیث میں آنحضرت ﷺ کی طرف سے یہ تاکید پائی جاتی ہے کہ آپ کی باتیں دوسروں کو پہنچائی جائیں۔ اور اس بات کا ذکر کہ شاید وہ لوگ سننے والوں کی نسبت بات کو زیادہ محفوظ رکھنے والے ہوں۔ اس لیے کہا گیا کہ ان غائبین کا جو صحابہ سے آنحضرت ﷺ کی باتیں سنیں پھر یہ فرض ہے کہ وہ ان کو یاد رکھ کر دوسروں کو وہی باتیں پہنچا دیں۔ پس آنحضرت ﷺ کے ان ارشادات کا ماحصل یہ ہے کہ آپ کی باتیں یعنی حدیث نبوی ضائع نہ ہو بلکہ ایک دوسرے کو مسلمان اسے پہنچاتے رہیں۔ یہ دوسری شہادت اس امر کی ہے کہ آنحضرت ﷺ یہ چاہتے تھے اور صحابہ کو بار بار آپ نے یہ تاکید فرمائی کہ آپ کی حدیث بلاتغیر وتبدل دوسرے لوگوں تک پہنچائی جائے۔

آنحضرت ﷺ کے مسائل دینی کو سمجھانے اور یاد کرانے کیلئے دہرانے کی عادت:

بہت سی حدیثوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ بعض ضروری باتوں کو تین تین دفعہ دہرایا کرتے تھے۔ تاکہ سننے والے اچھی طرح آپ کی بات کو سمجھ جائیں:

عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ كَانَ إِذَا تَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ أَعَادَهَا ثَلَاثًا حَتّٰى تُفْهَمَ عَنْهُ، وَإِذَآ أَتَى عَلٰى قَوْمٍ فَسَلَّمَ عَلَيْهِمْ سَلَّمَ عَلَيْهِمْ ثَلَاثًا. [صحيح البخاري: 95]

یعنی ''تین دفعہ بیان کرنے سے غرض آپ کی یہ ہوتی تھی کہ سننے والا آپ کی بات کو سمجھ جائے۔ دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہ کو جب ایک بات سمجھ میں نہ آئے تو خود دوبارہ سہ بارہ آنحضرت ﷺ سے دریافت کر لیتے تھے۔ ابن ابی مُلَیکہ کی روایت بخاری میں ہے:

أَنَّ عَائِشَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ ﷺ كَانَتْ لَا تَسْمَعُ شَيْئًا لَا تَعْرِفُهُ إِلَّا رَاجَعَتْ فِيهِ حَتّٰى تَعْرِفَهُ. [صحيح البخاري: 103]

یعنی سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس اگر رسول اللہ ﷺ کوئی بات بیان فرماتے اور وہ ان کی سمجھ میں نہ آتی تو آپ بار بار پوچھتیں یہاں تک کہ اچھی طرح سے سمجھ لیتیں۔

اب ایک طرف آنحضرت ﷺ کا خود ایک بات کو بار بار بیان کرنا تاکہ سننے والے اچھی طرح سمجھ لیں۔ دوسری طرف خود صحابہ کا ایک بات کو آپ سے دریافت کرنا جب پہلی دفعہ بیان کرنے سے سمجھ میں نہ آئے۔ یہی دونوں امور اس بات پر شاہد ہیں کہ آپ حدیث کی صحت اور سمجھانے میں اور صحابہ اس کے محفوظ رکھنے اور سمجھنے میں پوری

کوشش کرتے تھے۔ یہ تیسرا سامان حفاظت حدیث کا تھا جو آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ہی پایا جاتا تھا۔

جھوٹی حدیث پر وعید:

چوتھا سامان حفاظت حدیث کا آنحضرت ﷺ کے وہ وعید تھے جو آپ نے حدیث میں جھوٹ بولنے والے کے لیے بیان فرمائے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: "اتَّقُوا الْحَدِيثَ عَنِّي إِلَّا مَا عَلِمْتُمْ فَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ". [جامع الترمذي: 2951]

ابن عباس ؓ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے بیان فرمایا: ''مجھ سے صرف وہی حدیث بیان کرو جس کو تم جانتے ہو کہ میری حدیث ہے۔ جو شخص مجھ پر عمداً جھوٹ بنائے گا وہ اپنی جگہ آگ میں سمجھے۔''

عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدَبٍ وَالْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَا: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: "مَنْ حَدَّثَ عَنِّي بِحَدِيثٍ يُرَى أَنَّهُ كَذِبٌ فَهُوَ أَحَدُ الْكَاذِبِينَ". [صحيح مسلم: 1]

یعنی سمرہ بن جندب اور مغیرہ بن شعبہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا

کہ ''جو شخص میری طرف سے کوئی حدیث بیان کرے اور وہ جانتا ہو کہ یہ جھوٹ ہے وہ کاذب ہے۔''

بخاری میں بھی اس مضمون کی روایتیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: "لَا تَكْذِبُوا عَلَيَّ، فَإِنَّهُ مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ فَلْيَلِجِ النَّارَ". [صحيح البخاري: 106]

اور سلمہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ: "مَنْ يَقُلْ عَلَيَّ مَا لَمْ أَقُلْ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ". [صحيح البخاري: 109]

اسی مضمون کی روایتیں حضرت انس، ابو ہریرہ اور زبیر رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں۔ یہ حدیث قریباً بیس صحابہ رضی اللہ عنہم سے صحیح احادیث میں مروی ہے۔ اس لیے حدیث متواتر کا مرتبہ رکھتی ہے۔

صحابہ کا بیان حدیث میں سخت احتیاط سے کام لینا:

اگر اس قسم کی احادیث کے مضمون کو اور بھی غور کی نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ صحابہ ہر وقت اس بات سے ترساں رہتے تھے کہ کوئی غلط لفظ ان کے منہ سے نہ نکل

جائے اور اس لیے جب تک کسی حدیث کے متعلق انہیں یقین کامل نہ ہوتا کہ یہ آنحضرت ﷺ کی حدیث ہے تو وہ اسے بیان کرنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ بخاری میں یہ حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قَالَ أَنَسٌ: إِنَّهُ لَيَمْنَعُنِي أَنْ أُحَدِّثَكُمْ حَدِيثًا كَثِيرًا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: "مَنْ تَعَمَّدَ عَلَيَّ كَذِبًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ". [صحيح البخاري: 108]

یعنی حضرت انس رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے فرمایا کہ بہت سی حدیثیں بیان کرنے سے مجھے یہ بات روکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے: ''جو شخص جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولے گا وہ آگ میں جائے گا۔''

ایسا ہی عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

قَالَ: قُلْتُ لِلزُّبَيْرِ: إِنِّي لَا أَسْمَعُكَ تُحَدِّثُ عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ كَمَا يُحَدِّثُ فُلَانٌ وَفُلَانٌ؟ قَالَ: أَمَا إِنِّي لَمْ أُفَارِقْهُ وَلٰكِنْ سَمِعْتُهُ يَقُولُ: "مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ". [صحيح البخاري: 107]

یعنی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے اپنے والد زبیر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے میں آپ کو رسول اللہ ﷺ سے اس طرح حدیثیں بیان کرتا ہوا نہیں سنتا

جس طرح فلاں اور فلاں آدمی بیان کرتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ اس کی یہ وجہ نہیں کہ میں آنحضرت ﷺ سے جدا رہتا تھا۔ لیکن میں نے آپ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ''جو شخص مجھ پر جھوٹ بولے گا وہ آگ میں داخل ہوگا۔''

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا اس سے مطلب یہ نہیں تھا کہ دوسرے لوگ حدیثیں بیان کرتے ہیں جھوٹ بولتے ہیں۔ بلکہ انہوں نے فرمایا کہ چونکہ جھوٹ کے متعلق سخت ممانعت اور وعید عذاب ہے۔ اس لیے میں زیادہ حدیثیں بیان نہیں کرسکتا۔ کیونکہ ان کے متعلق مجھے یقین کامل نہیں کہ آنحضرت ﷺ نے کیا فرمایا تھا۔ کذب کے معنوں میں صرف یہی داخل نہیں کہ کوئی شخص ایک خبر یا واقعہ کو غلط جان کر بیان کرے۔ بلکہ کذب بمعنی خطا بھی آتا ہے اور محاورہ عرب میں کذب کا استعمال ان معنوں میں بہت ہے۔ احادیث میں بھی اس کا استعمال پایا جاتا ہے۔ یعنی جہاں کسی شخص نے غلط واقعہ بیان کیا حالانکہ وہ اسے خود غلط نہیں سمجھتا تھا تو اس کے متعلق لفظ کذب آیا ہے۔ جس کی تشریح بالاتفاق اَخْطَأَ سے کی گئی ہے۔ پس جن صحابہ کے متعلق یہ ذکر ہے کہ انہوں نے کہا ہم ڈرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ پر کذب نہ بولیں۔ ان کا یہ منشا ہرگز نہ ہوسکتا تھا کہ ہم ڈرتے ہیں کہ جس کلام کو ہم نے کبھی آنحضرت ﷺ سے نہیں سنا اس کو عمداً آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب نہ کردیں۔ بلکہ ڈر اسی بات کا ہوسکتا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ غلطی سے کوئی غلط لفظ یا قول آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب ہوجائے۔ پس صحابہ

آنحضرت ﷺ کی حدیث کی روایت کرنے میں پرلے درجہ کے محتاط تھے اور اس وعید کے سبب سے کہ جو کذب علی النبی کے متعلق وہ خود آنحضرت ﷺ سے سن چکے تھے وہ ایسی حدیث کے بیان کرنے کی بھی جرأت نہ کرتے تھے۔ جس کے متعلق انہیں یہ اندیشہ ہو کہ غلط بیانی ہو جائے گی۔ اس وعید میں اور صحابہ کے اس کو روایات بیان کرتے وقت اس طرح مدنظر رکھنے میں ایک اور قطعی شہادت ملتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے پورا پورا اہتمام اس بات کا کیا کہ آپ کی احادیث کے پہنچانے میں کسی قسم کی آمیزش نہ ہو اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ کی ان ہدایات پر پوری طرح عمل کر کے دکھایا۔

روایت حدیث میں سب صحابہ یکساں نہیں:

مذکورہ بالا احادیث کو اچھی طرح سے سمجھنے کے لیے یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ حدیث کے سننے، اس کے سمجھنے اور اس کو محفوظ رکھنے میں سب صحابہ یکساں نہ تھے۔ بعض کو زیادہ وقت آنحضرت ﷺ کی صحبت میں رہنا میسر آتا تھا بعض کو بہت کم۔ بعض فہم و فراست سے دوسروں کی نسبت زیادہ حصہ رکھتے تھے۔ اور سب کی قوت حافظہ بھی برابر نہ تھی۔ اسی فرق کی وجہ سے روایت حدیث میں بعض کا مرتبہ بعض سے زیادہ ہے۔ مثلاً بہت سے صحابی ایسے تھے کہ اپنے کام بھی کرتے تھے اور فرصت کے وقت آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے تھے۔ بعض نے باریاں مقرر کی ہوئی تھیں۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ایک انصاری کے ساتھ جو آپ کا ہمسایہ تھا رسول اللہ ﷺ کے پاس آنے کے لیے باری مقرر کی ہوئی تھی۔ ایک دن وہ رسالت

آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اس دن کی خبریں اور وحی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پہنچاتے اور دوسرے دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسا کرتے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا اشتیاق حفظ حدیث:

پھر بعض صحابہ ان سے بھی بڑھ کر مشتاق اس بات کے تھے کہ سارا وقت ہی آنحضرت ﷺ کے پاس بیٹھے رہیں۔ انہی میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ جن کی حدیثیں دوسرے صحابیوں سے بہت زیادہ پائی جاتی ہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا اشتیاق حفاظت حدیث کا اس قدر تھا کہ آنحضرت ﷺ بھی اس سے خوب آگاہ تھے۔ چنانچہ ایک موقعہ پر جب ابو ہریرہؓ نے آنحضرت ﷺ سے یہ سوال کیا:

[يَا رَسُوْلَ اللهِ! مَنْ أَسْعَدُ النَّاسِ بِشَفَاعَتِكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ؟]

تو آپ نے قبل اس کا جواب دینے کے فرمایا:

["لَقَدْ ظَنَنْتُ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ! أَنْ لَّا يَسْأَلَنِي عَنْ هٰذَا الْحَدِيثِ أَحَدٌ أَوَّلُ مِنْكَ، لِمَا رَأَيْتُ مِنْ حِرْصِكَ عَلَى الْحَدِيثِ".] [صحیح البخاری:99]

یعنی آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اے ابو ہریرہ! میں اس وجہ سے کہ تمہارا اشتیاق حدیث کے لیے خوب جانتا ہوں۔ اس بات کو جانتا تھا کہ تم ہی پہلے مجھ سے یہ سوال پوچھو گے۔'' (صحیح البخاری: کتاب العلم)

ایسا ہی صحیح بخاری میں دوسری جگہ یہ روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قَالَ: إِنَّ النَّاسَ يَقُولُونَ أَكْثَرَ أَبُو هُرَيْرَةَ، وَلَوْلَآ آيَتَانِ فِي كِتَابِ اللهِ مَا حَدَّثْتُ حَدِيثًا، ثُمَّ يَتْلُو: ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ﴾ إِلَى قَوْلِهِ ﴿الرَّحِيْمُ ۝١٦٠﴾ [البقرة: 2:159-160] إِنَّ إِخْوَانَنَا مِنَ الْمُهَاجِرِينَ كَانَ يَشْغَلُهُمُ الصَّفْقُ بِالأَسْوَاقِ، وَإِنَّ إِخْوَانَنَا مِنَ الأَنْصَارِ كَانَ يَشْغَلُهُمُ الْعَمَلُ فِي أَمْوَالِهِمْ، وَإِنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ كَانَ يَلْزَمُ رَسُولَ اللهِ ﷺ بِشِبَعِ بَطْنِهِ وَيَحْضُرُ مَا لَا يَحْضُرُونَ، وَيَحْفَظُ مَا لَا يَحْفَظُونَ. [صحيح البخاري: 118]

یعنی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ لوگ کہتے ہیں کہ ابو ہریرہ بہت حدیثیں بیان کرتا ہے اور اگر قرآن کریم میں دو آیتیں نہ ہوتیں تو میں کوئی حدیث بیان نہ کرتا۔ پھر آپ یہ آیتیں پڑھتے: ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ﴾ (جن میں ہدایت اور بینات کے چھپانے پر سخت وعید آیا ہے۔) پھر فرمایا کہ بات یہ ہے کہ ہمارے بھائی جو مہاجرین تھے ان کو تو بازار میں خرید وفروخت روکے رکھتی تھی اور ہمارے بھائی جو انصار میں سے تھے ان کو اپنے کاروبار روکے رکھتے تھے۔ اور ابو ہریرہ کا یہ حال تھا کہ دین سیکھنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ لگا رہتا۔ اس لیے وہ ایسے

ایسے واقعات کو مشاہدہ کرتا تھا جن کو دوسرے صحابی نہیں کرتے تھے۔ اور ایسی ایسی باتیں رسول اللہ ﷺ سے سن کر یاد رکھتا تھا جن کو دوسرے یاد نہیں رکھتے تھے۔

پس بڑی بھاری وجہ کہ بعض صحابہ کی احادیث کم پائی جاتی ہیں اور بعض کی زیادہ، یہی ہے کہ بعض کو آنحضرت ﷺ کی صحبت میں رہنے کا زیادہ اتفاق ہوتا تھا اور بعض کو کم۔ اس کی تائید میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ میں اور حاکم نے مستدرک میں یہ روایت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ سے بیان کی ہے:

فَلَا أَشُكُّ أَنَّهُ سَمِعَ مِنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ مَا لَمْ نَسْمَعْ وَذٰلِكَ أَنَّهُ كَانَ مِسْكِينًا لَا شَيْءَ لَهُ ضَيْفًا لِرَسُولِ اللهِ ﷺ.

[جامع الترمذي: 3837]

ایسا ہی ابن عمر کا یہ قول احمد اور ترمذی نے بیان کیا ہے ہے جو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے متعلق ہے: [كُنْتَ أَلْزَمَنَا لِرَسُولِ اللهِ ﷺ وَأَحْفَظَنَا لِحَدِيثِهِ.] [جامع الترمذی: 3836] اور بخاری نے تاریخ میں اور بیہقی نے یہ روایت محمد بن عمارہ بن حزم سے کی ہے:

أَنَّهُ قَعَدَ فِي مَجْلِسٍ فِيْهِ مَشِيْخَةٌ مِّنَ الصَّحَابَةِ بِضَعَةَ عَشَرَ رَجُلًا، فَجَعَلَ أَبُوْ هُرَيْرَةَ يُحَدِّثُهُمْ عَنْ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ فَلَا يَعْرِفُهُ بَعْضُهُمْ فَيُرَاجِعُوْنَ فِيْهِ حَتّٰى يَعْرِفُوْهُ ثُمَّ

يُحَدِّثُهُمْ بِالْحَدِيْثِ كَذٰلِكَ حَتّٰى فَعَلَ مِرَارًا فَعَرَفْتُ يَوْمَئِذٍ أَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ أَحْفَظَ النَّاسِ.

[التاريخ الكبير: جلد1، صفحہ 187_186]

اور خود آنحضرت ﷺ کی زندگی میں بھی لوگ کہا کرتے تھے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بہت حدیثیں بیان کرتا ہے۔ چنانچہ ایک دن ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک ایسا کہنے والے سے پوچھا کہ کل عشاء کی نماز میں آنحضرت ﷺ نے کون کون سی سورتیں پڑھی تھیں؟ وہ نہ بتا سکا اور پھر انہوں نے اس کو بتا دیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو ابتدا سے ہی یہ شوق تھا کہ آنحضرت ﷺ کے متعلق معمولی سے معمولی باتوں کو توجہ سے دیکھتے اور یاد رکھتے تھے۔ ان تمام واقعات سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کے علم کی اشاعت آنحضرت ﷺ کی زندگی میں ہی شروع ہوگئی تھی۔ اور آپ کے سامنے ہی حدیثیں پھیلنی شروع ہوگئی تھیں اور آپ نے سب وعید ان لوگوں کے لیے بیان فرمائے تھے جو آپ کی حدیث میں کسی قسم کا تغیر وتبدل کریں۔ انہی تمام احتیاطوں کی وجہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم حدیث کے بیان کرنے میں اعلیٰ درجہ کے محتاط تھے۔ اور اس ڈر سے کہ شاید کوئی غلطی نہ ہوجائے بغیر یقین کامل کے کسی حدیث کو بیان نہ کرتے تھے۔ جو لوگ صحیح احادیث بیان کرنے میں اعلیٰ درجہ کے محتاط تھے ان کی نسبت یہ وہم کرنا کہ انہوں نے وضعی حدیثیں بنا کر پھیلائیں پرلے درجہ کی حماقت ہے۔

پہلی صدی کے آخر عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے احکام حفاظت حدیث کیلئے:

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ پر افترا کا الزام ایک شرمناک افترا ہے۔ اور اس کی کوئی شہادت اسلامی تاریخ میں نہیں ملتی۔ بلکہ اس کے برخلاف یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب تک صحابہ رضی اللہ عنہم زندہ رہے اس وقت تک کوئی وضعی حدیث اسلام میں نہیں آئی۔ اصل بات یہ ہے کہ احادیث کا وضع ہونا صحابہ بلکہ تابعین کے زمانہ کے بھی بعد شروع ہوا اور علماء محققین نے اس خطرہ کو محسوس کر کے جلدی اس کا تدارک شروع کر دیا۔ پہلی صدی ہجری کے اخیر تک کوئی اس قسم کی شہادت نہیں ملتی جس سے یہ ظاہر ہو کہ وضع احادیث اس وقت شروع ہو چکا تھا۔ بلکہ اس امر کی تاریخی شہادتیں ملتی ہیں کہ اس وقت تک اسلامی دنیا میں وضعی احادیث کا نام ونشان نہ پایا جاتا تھا۔ چنانچہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق جو پہلی صدی ہجری کے آخر میں خلیفہ ہوئے۔ یہ روایت صحیح بخاری میں موجود ہے:

وَكَتَبَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ إِلَىٰ أَبِي بَكْرِ بْنِ حَزْمٍ: انْظُرْ مَا كَانَ مِنْ حَدِيثِ رَسُولِ اللهِ ﷺ فَاكْتُبْهُ، فَإِنِّي خِفْتُ دُرُوسَ الْعِلْمِ وَذَهَابَ الْعُلَمَآءِ، وَلَا تَقْبَلْ إِلَّا حَدِيثَ النَّبِيِّ ﷺ، وَلْتُفْشُوا الْعِلْمَ، وَلْتَجْلِسُوا حَتّٰى يُعَلَّمَ مَنْ لَّا يَعْلَمُ، فَإِنَّ الْعِلْمَ لَا يَهْلِكُ حَتّٰى يَكُونَ سِرًّا.

[صحيح البخاري، كتاب العلم، باب كيف يقبض العلم]

یعنی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے ابوبکر بن حزم رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا (ابوبکر بن حزم آپ کے ماتحت حاکم مدینہ تھے اور خود تابعی تھے) کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جو حدیث ملے اسے نگاہ رکھو اور اسے لکھ لو۔ میں ڈرتا ہوں کہ علم (یعنی علم حدیث) گم نہ ہو جائے اور علماء سب اٹھ نہ جائیں اور سوائے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کے اور کچھ قبول نہ کرو۔ اور چاہئے کہ علم کو پھیلایا جائے اور علمی مجالس ہوا کریں تاکہ جو لوگ (حدیث سے) ناواقف ہیں ان کو تعلیم دی جائے۔ کیونکہ علم نابود نہیں ہوتا جب تک کہ وہ مخفی نہ ہو جائے۔

ابونعیم نے اپنی تاریخ اصبہان میں لکھا ہے کہ یہ حکم صرف حاکم مدینہ کے نام ہی نہیں بھیجا گیا تھا بلکہ تمام صوبوں کے حاکموں کے نام یہی حکم خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے بھیجا تھا۔ خواہ یہ حکم ایک حاکم کے نام بھیجا گیا ہو یا سب کے۔ میں جو استدلال اس سے کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس وقت تک جب خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے یہ حکم لکھا جو تاریخی طور پر ثابت ہے مسلمانوں کے درمیان وضعی احادیث پیدا نہ ہوئی تھیں۔ اور یہ بات اس حکم کے الفاظ پر غور کرنے سے ثابت ہوتی ہے، امیر المومنین نے جس بات کا اندیشہ ظاہر کیا ہے وہ یہ ہے کہ علماء مرتے جاتے ہیں ایسا نہ ہو کہ علم حدیث گم ہو جائے۔ اس لیے تم تمام حدیثوں کو جو تمہیں ملیں لکھ لو۔ اور وضعی حدیث کا نام تک بھی نہیں لیا۔ اگر وضعی احادیث اس وقت پیدا ہو گئی تھیں تو بڑا خطرہ یہ نہیں ہونا چاہئے تھا کہ علماء مر جائیں گے تو علم حدیث گم ہو جائے گا۔ بلکہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ وضعی احادیث بکثرت مروج

ہوگئی ہیں اور صحیح احادیث کو ان سے الگ کرنا ضروری ہے اور یہ بھی حکم دیا کہ علمی تذکرے بڑھائے جائیں اور علمی مجالس منعقد کی جائیں تاکہ ناواقف لوگ بھی احادیث سے واقف ہوجائیں۔ اور یہ جو کہا کہ آنحضرت ﷺ کی حدیث کے سوائے اور کچھ قبول نہ کیا جائے۔ اس کا مطلب صرف اسی قدر ہے کہ اور مثلاً کسی صحابی کا قول آنحضرت ﷺ کی حدیث سے خلط نہ کردیا جائے۔ بہرحال وضعی احادیث کا اس تحریر میں ذکر تک بھی نہیں۔ چہ جائیکہ ان کی کثرت یا ان کے مروج ہونے کا ذکر ہو۔

صحابہ کا حدیث کی صحت معلوم کرنے کے لیے لمبے سفر کرنا:

بہت سے اور واقعات تاریخ میں پائے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے صحابہ کسی حدیث کے قبول کرنے یا اس کو آگے بیان کرنے میں بہت احتیاط سے کام لیتے تھے۔ بلکہ ایک ایک حدیث کے متعلق صحیح علم حاصل کرنے کی خاطر سینکڑوں میلوں کے سفر اختیار کرتے اور ہر طرح کی صعوبتیں برداشت کرتے تھے۔ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کا تذکرہ صحیح بخاری میں موجود ہے کہ ایک حدیث کی خاطر انہوں نے مدینہ سے شام کا سفر کیا۔ دیکھو [بَابُ الْخُرُوجِ فِي طَلَبِ الْعِلْمِ] جہاں لکھا ہے: [وَرَحَلَ جَابِرُ بْنُ عَبْدِ اللهِ مَسِيرَةَ شَهْرٍ إِلَى عَبْدِ اللهِ بْنِ أُنَيْسٍ فِي حَدِيثٍ وَاحِدٍ] یعنی جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے ایک مہینہ کا سفر عبداللہ بن انیس کی طرف صرف ایک حدیث کی خاطر کیا۔ جس کا تذکرہ جابر رضی اللہ عنہ کے اپنے الفاظ میں یوں موجود ہے:

بَلَغَنِي عَنْ رَجُلٍ حَدِيثٌ سَمِعَهُ مِنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ فَاشْتَرَيْتُ بَعِيرًا ثُمَّ شَدَدْتُ رَحْلِي، فَسِرْتُ إِلَيْهِ شَهْرًا حَتّٰى قَدِمْتُ الشَّامَ، فَإِذَا عَبْدُ اللهِ بْنُ أُنَيْسٍ. فَقُلْتُ لِلْبَوَّابِ: قُلْ لَهُ جَابِرٌ عَلَى الْبَابِ. فَقَالَ ابْنُ عَبْدِ اللهِ: قُلْتُ: نَعَمْ فَخَرَجَ فَاعْتَنَقَنِي، فَقُلْتُ: حَدِيثًا بَلَغَنِي عَنْكَ أَنَّكَ سَمِعْتَهُ مِنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ، فَخَشِيتُ أَنْ أَمُوتَ قَبْلَ أَنْ أَسْمَعَهُ. [مسند الإمام أحمد: 16042]

ایسا ہی ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ روایت ہے کہ انہوں نے عقبہ بن عامر کی طرف ایک حدیث سننے کے لیے لمبا سفر کیا۔ ایسا ہی ایک اور صحابی کا ذکر ہے کہ اس نے فضالہ بن عبید کو ملنے کے لیے مصر کا سفر کیا۔ کیونکہ وہ ایک حدیث رسول اللہ ﷺ کی بیان کرتے تھے۔ یہ تھا صحابہ کا جوش اور عشق آنحضرت ﷺ کی حدیث کی تلاش میں کہ آج سے تیرہ سو برس پہلے جو کچھ سفر کی صعوبتیں تھیں وہ ان کی نظر میں ایک حدیث کے سننے کے بالمقابل ہیچ تھیں۔ یہی حال تابعین کا معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ ابو العالیہ کی روایت سے قطیب نے بیان کیا ہے کہ

كُنَّا نَسْمَعُ عَنْ أَصْحَابِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ فَلَا نَرْضٰى حَتّٰى خَرَجْنَا إِلَيْهِمْ فَسَمِعْنَا مِنْهُمْ.

یعنی ''ہم آنحضرت ﷺ کے صحابیوں کی روایت سے ایک حدیث کو سنتے

تھے مگر ہم صبر نہ کرتے تھے جب تک سفر کر کے خود ان صحابیوں کے منہ سے اس حدیث کو نہ سن لیں۔''

اس قسم کے کئی واقعات تاریخ میں موجود ہیں۔ جن سب کا بیان کرنا موجب طوالت ہوگا۔

آنحضرت ﷺ کے سامنے بعض احادیث کا تحریر میں آجانا:

احادیث کے قابل اعتبار ہونے پر بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ ابتدا میں تحریر میں نہیں لائی گئیں۔ بلکہ زبانی سلسلہ روایت سے ہی محدثین تک پہنچی ہیں۔ میور کہتا ہے کہ:

''یہ کسی صورت میں تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ عرب اپنے حافظہ پر ایسا ہی بھروسہ کر سکتے تھے جیسا تحریر پر۔ اور پھر لکھتا ہے کہ نہ صرف حافظہ پورے طور پر حدیث کو محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا بلکہ زبانی روایت کے سلسلہ میں غلطیوں اور مبالغہ کی آمیزش بہت زیادہ ہوجاتی ہے۔''

اب اول تو یہ کہنا کسی صورت میں صحیح نہیں کہ پہلی صدی کے اخیر تک حدیث کا کوئی حصہ بھی لکھا نہیں گیا۔ ایسی روایات بکثرت موجود ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے وقت میں بھی بعض لوگ حدیث کو لکھ لیا کرتے تھے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ حدیث لکھا کرتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس بھی لکھی ہوئی حدیث کا موجود

ہونا ثابت ہے۔ فتح مکہ والے سال میں خزاعہ نے بنی لیث کا ایک آدمی بطور کسی گزشتہ خون کے قصاص کے مار ڈالا جس پر آنحضرت ﷺ نے ایک خطبہ پڑھا اور جب آپ تمام کر چکے تو اہل یمن سے ایک آدمی آپ کے پاس آیا اور عرض کیا کہ مجھے یہ خطبہ لکھوا دیجئے۔ جس پر آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ اسے لکھ دیا جائے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے خطبہ پڑھا تو لوگوں نے اسے اپنے حافظوں میں محفوظ کر لیا تھا۔ ورنہ بعد میں لکھا کیونکر جاتا۔ یہ تمام روایتیں صحیح بخاری میں موجود ہیں۔ اور ان سے یہ صاف ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے وقت میں ہی بعض صحابہ حدیثوں کو لکھ لیا کرتے تھے اور ایسا ہی یہ بھی شہادت ملتی ہے کہ لکھنے کا رواج آپ کے بعد اور بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ یہ بات میور کو بھی تسلیم کرنی پڑی ہے کیونکہ ایک موقعہ پر وہ لکھتا ہے کہ اگر ان باتوں کو جو پیش کی جاتی ہیں تسلیم بھی کر لیا جائے تو ان سے اس سے بڑھ کر اور کوئی بات ثابت نہیں ہوتی کہ بعض صحابہ کے پاس آنحضرت ﷺ کی احادیث کی تحریری یادداشتیں تھیں۔ مگر وہ لکھتا ہے کہ جو کتب احادیث اس وقت موجود تھیں ان سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کون سی احادیث کسی محدث نے تحریری یادداشت سے لی تھیں؟ اور کون سی صرف زبانی روایت کے سلسلے سے؟

میں کہتا ہوں کہ یہی طریق درست ہے کیونکہ اگر کسی حدیث کے متعلق سلسلہ روایت کو چھوڑ کر صرف اسی قدر پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ یہ حدیث کسی پرانی یادداشت سے لی گئی ہے تو اول تو تحقیق کا دروازہ بند ہو جاتا کیونکہ سلسلہ رواۃ کے معلوم ہونے پر تو

حدیث پر جرح بھی ہوسکتی ہے۔لیکن صرف ایک پرانی یادداشت کا حوالہ دینے سے آئندہ نسلوں کو یہ کیونکر معلوم ہوسکتا کہ وہ یادداشت کیسی تھی؟ یا کس شخص کی لکھی ہوئی تھی؟ پس ایسی حدیثیں بالکل پایہ اعتبار سے ساقط ہو جاتیں۔اور یہ بات صاف ہے کہ ایسی یادداشتوں کا اول تو محفوظ رکھنا آسان امر نہ تھا اور پھر بڑی مشکل یہ پڑتی کہ یہ کیونکر معلوم ہوتا کہ فلاں یادداشت واقعی فلاں صحابی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے؟ یا بعد میں کسی نے جعل بنالیا ہے۔کیونکہ زبانی سلسلہ میں تو ہر ایک راوی کا نام ظاہر کرنا پڑتا ہے اور ایک ایک تنقید کے نیچے آسکتا ہے۔مگر تحریری یادداشتوں میں ایک ایسے زمانہ میں جب چھاپہ خانہ کا رواج نہیں تھا اور اس لیے عام طور پر کوئی تحریر مشتہر نہ ہوسکتی تھی کہ سب لوگ یقین کرلیں کہ فلاں بات کے لکھنے والا واقعی فلاں شخص ہے۔ایسے زمانہ اور ان حالات میں اگر تحریری یادداشتوں سے حدیثیں جمع کی جاتیں تو وہ ایسی مشتبہ ہوجاتیں کہ بالکل قابل اعتبار نہ رہتیں۔علاوہ ازیں محدثین خود کب اس بات پر مطمئن ہوسکتے تھے کہ ایک یادداشت ان کے ہاتھ لگ گئی ہے کیونکہ اس میں وہ خود اپنی تنقید سے کام نہ لے سکتے تھے بلکہ لازماً سلسلہ رواۃ کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔جب تک راویوں کے ذریعہ سے کوئی حدیث کسی صحابی تک نہ پہنچ جائے اس وقت تک وہ قطعاً اس کے متعلق مطمئن نہ ہوسکتے تھے۔تحریری یادداشتیں اصل میں ابتدا میں بھی حافظہ کو تازہ کرنے کے لیے تھیں اور محدثین نے بھی ان سے یہی کام لیا۔یعنی ان کو بطور تائیدی شہادت قبول کیا۔اس لیے ان کا ذکر کرنے کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔

عام طور پر حدیث کے نہ لکھا جانے کی وجوہات:

مگر معترض کہتا ہے کہ اگر تحریری یادداشتیں رکھی بھی گئیں تو صرف چند حدیثوں کی رکھی گئیں اور عام طور پر حدیث لکھنے کا رواج ابتدائی زمانہ میں نہیں ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ آنحضرت ﷺ نے خود بھی احادیث کے لکھنے سے روکا اور آپ کا اس ممانعت سے یہی مطلب تھا کہ عام طور پر حدیث کو نہ لکھا جائے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ قرآن جیسے جیسے نازل ہوتا تھا لکھا جاتا تھا اور اس کا لکھنا ضروری تھا۔ اس لیے اس اندیشہ سے کہ مبادا حدیث کے عام طور پر لکھا جانے سے قرآن کریم اور حدیث خلط ملط نہ ہو جائیں۔ آپ نے حدیث کے لکھنے کی ممانعت کی اور جہاں ایسا اندیشہ نہیں تھا وہاں لکھنے کی اجازت بھی دی۔ کیونکہ آپ کی اجازت سے حدیثوں کا لکھا جانا بھی ثابت ہے۔

عام طور پر حدیث کے لکھا جانے میں ایک اور خطرہ بھی تھا وہ یہ کہ اگر حدیث کے لکھنے کا رواج ہو جاتا تو حدیث کو زبانی یاد رکھنے کی ضرورت بالکل مفقود ہو جاتی اور اس طرح پر زبانی روایت کا سلسلہ قطعاً موقوف ہو کر صرف یادداشتوں پر حدیث کی بنا رہ جاتی جس میں جعل کی گنجائش بہت زیادہ ہوتی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ قرآن کے لکھنے میں یہ دقت کیوں پیش نہ آئی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم اور حدیث کا مقابلہ اس پہلو پر نہیں ہو سکتا۔ قرآن شریف کی ہر ایک آیت سینکڑوں آدمی اس کے نازل ہوتے ہی حفظ کر لیتے تھے اور اس کا تحریر میں لانا حفاظت کے لیے ایک زائد سامان تھا۔ علاوہ ازیں قرآن شریف عام طور پر نمازوں میں پڑھا جاتا تھا اور اس کی کوئی آیت

چھپی نہ رہ سکتی تھی۔ اس کے لیے ابتدا سے ہی یہ سامان تھا کہ الگ الگ سورتیں تھیں اور رسول اللہ ﷺ ایک آیت کے نازل ہوتے ہی فرمادیا کرتے تھے کہ یہ آیت فلاں سورت میں فلاں مقام پر رکھی جائے۔ لیکن حدیث کو یہ باتیں حاصل نہ تھیں کہ بعض احادیث (اس میں شک نہیں) ایسی تھیں کہ تمام مسلمانوں کے لیے ان کا جاننا ضروری تھا۔ مثلاً احکام نماز، زکوٰۃ وغیرہ۔ مگر بہت سی حدیثیں ایسی تھیں کہ وہ کل صحابہ کے علم میں نہ آ سکتی تھیں۔ ایک شخص ایک وقت آیا اور اس نے کوئی بات آنحضرت ﷺ سے پوچھی۔ وہ بات اپنے وقت پر ہوگئی اور کسی صحابی نے جو اس وقت موجود تھا اس کو یاد رکھ لیا۔ مگر قرآن کریم کی آیات کی طرح احادیث کا عام طور پر اعلان نہ ہوتا تھا۔ یعنی آیت جب نازل ہوتی تو اس کو لکھ بھی لیا جاتا اور عام طور پر اس کا اعلان بھی ہو جاتا۔ حافظ لوگ اس کو مطابق ہدایت آنحضرت ﷺ اس کی جگہ پر رکھ کر یاد بھی کر لیتے اور عام طور پر مسلمانوں میں اس کا چرچا ہو جاتا۔ خالی لکھنا کافی نہ تھا اور نہ ہی خالی لکھ لینا حدیث کے لیے کافی ہوتا۔ بلکہ مشکلات اور بھی بڑھ جاتیں۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم کے جمع کرنے کی وجہ یہ تھی کہ حافظہ پر اعتبار نہ تھا یہ بالکل غلط ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب جمع کیلئے اولاً ابوبکر رضی اللہ عنہ کو تحریک کی تو وجہ یہ بیان کی کہ بہت سے حافظان قرآن یمامہ کی لڑائی میں شہید ہو گئے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ قرآن کریم کے لکھے ہوئے اجزا کو ایک جگہ جمع کیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ تمام حافظوں کی موت سے قرآن کریم کا کوئی حصہ مشتبہ ہو جائے۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ

حافظہ پر اعتبار تو تھا مگر ڈر یہ تھا کہ جن لوگوں نے کل قرآن کریم کو حفظ کیا ہوا ہے وہ جنگوں میں شہید ہو کر سب کے سب دنیا سے اٹھ نہ جائیں۔ غرض کہ قرآن کریم کی حفاظت کے لیے علاوہ تحریر کے اور بہت سے سامان موجود تھے۔ جو حدیث کو میسر نہ آ سکتے تھے۔ اس لیے اس کی حفاظت کا طریق صرف حافظہ کو ہی قرار دیا گیا۔ جب تک کہ وہ وقت نہ آ گیا کہ حدیث کا علم کافی طور پر پھیل کر اس قابل ہو گیا کہ اسے کتابوں میں جمع کر دیا جائے۔ اس قدر ہم تسلیم کرتے ہیں کہ حدیث کی ایسی حفاظت نہ ہوئی اور نہ ہو سکتی تھی جیسی قرآن کریم کی ہوئی۔ مگر تاہم تاریخی شہادت حدیث کی حفاظت کی بھی کافی موجود ہے۔

عربوں کا حافظہ پر بھروسہ:

کہا جاتا ہے کہ حافظہ پر اس قدر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا جس قدر تحریر پر۔ یہ قول اس زمانہ کے لیے تو بے شک درست ہے لیکن ابتدائی زمانہ میں بالخصوص عرب کے حافظہ نے جو حیرت انگیز کارروائیاں دکھائی ہیں وہ آج کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتیں۔ اگر عرب میں حافظہ ایسا ہی نا قابل اعتبار ہوتا جیسا کہ میور کہتا ہے تو آج نہ عرب کی جاہلیت اور ابتدائی اسلامی زمانہ کے اشعار ہی ہم تک پہنچتے اور نہ ہی لغت اور نحو کے علوم کی ان باریک باتوں تک ہم پہنچ سکتے جن سے آج ہم فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ عربی اشعار بعینہٖ اسی طرح کے سلسلہ رواۃ سے ہم تک پہنچے ہیں جس طرح احادیث۔ اور اصل بات یہ ہے کہ یہی ایک طریق اس زمانہ میں کسی علم کی حفاظت کا تھا۔ اشعار کے راوی نہ

صرف کثرت سے شعر ہی زبانی سلسلہ روایت سے بیان کر سکتے تھے بلکہ وہ شاعروں کے نام اور ان کے حالات سے بھی واقف ہوتے تھے اور ان کے شعروں میں جو حوالے ہوتے تھے ان سے بھی خوب آگاہ تھے۔ شعروں کے مشہور راویوں میں سے ایک اصمعی ہیں جنہوں نے اپنے متعلق لکھا ہے کہ قبل بلوغت کو پہنچنے کے میں نے بارہ ہزار شعر حفظ کر لیے تھے۔ (عقد الفرید)

کیا ان لوگوں کے لیے جن میں ایسے حافظہ والے لوگ موجود تھے چند ہزار حدیث کا یاد رکھ لینا کوئی مشکل امر تھا؟ ابو ضمضم کے متعلق اصمعی نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک موقعہ پر چند نوجوان بعد عشا کے اس کے پاس پہنچے اور بیان کیا کہ ہم تم سے کچھ باتیں سننا چاہتے ہیں۔ اس نے ان کو ایک سو شاعروں کے شعر سنائے جن سب کا نام عمر تھا۔ شعبی کہتا ہے کہ میں نے شعر سے کمتر روایت کسی علم میں نہیں کی۔ اور شعر میں میری روایت اس قدر ہے کہ اگر میں چاہوں تو برابر ایک مہینہ تک شعر پڑھتا چلا جاؤں اور کوئی شعر دوبارہ نہ آئے گا۔ پس اگر اس قدر اشعار جن کی تعداد لاکھوں تک پہنچی ہوئی ہے محض زبانی سلسلہ رواۃ سے اسلام سے بھی پہلے زمانہ سے ہم تک پہنچ گئے تو میں نہیں سمجھتا کہ حدیث کے اس سلسلہ سے پہنچنے میں مخالفین کو کون سی دقتیں نظر آتی ہیں؟

یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ شعر کا سلسلہ روایت یوں ہی کوئی لغو کام تھا۔ بلکہ لغت اور نحو کی بنا انہی اشعار پر ہے جو زبانی روایتوں سے پہنچے ہیں۔ ہر زمانہ میں جب کبھی کسی لفظ کے معنوں میں یا کسی نحو کے قاعدہ میں تنازعہ پیدا ہوا ہے تو شعر کی سند سے اس کا آخری

فیصلہ ہوتا رہا ہے اور کسی نے آج تک یہ اعتراض نہیں کیا کہ یہ شعر تو زبانی روایت سے مدت تک سے چلا آیا تھا اور بہت دیر بعد تحریر میں آیا، اس کا اعتبار کچھ نہیں۔ پس تعجب ہے کہ جس صورت میں نازک ترین مسائل لغت یا نحو کی زبانی یادداشتوں کی بنا پر حل کیے جا سکتے ہیں تو حدیث کے لیے اتنا شور کیوں مچایا جاتا ہے کہ زبانی روایتوں کے ہونے کی وجہ سے اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ صحابہ میں کثرت سے ایسے لوگ تھے جن کو پرانے شعر یاد تھے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی کئی ہزار شعر جاہلیت کے یاد تھے۔ تو کیا کئی سو احادیث وہ یاد نہ رکھ سکتی تھیں؟ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے متعلق یہ واقعہ دیوان عمر بن ابی ربیعہ کے شروع میں لکھا ہے کہ جب عمر چند شعر بنا کر ان کے پاس مشورہ کے لیے لایا کہ آیا یہ شائع کرنے کے قابل ہیں یا نہیں تو آپ نے صرف ایک ہی دفعہ اس سے سن کر دوبارہ سب کے سب خود سنا دیئے۔ یہ قریباً ستر شعر تھے۔ اس پر بعض حاضرین نے تعجب سے پوچھا کہ کیا یہ شعر آپ کو پہلے سے معلوم تھے؟ تو آپ نے ان کے تعجب پر تعجب کر کے جواب دیا: [اَوَ یَسْمَعُ أَحَدٌ شَیْئًا وَّلَا یَحْفَظُهُ؟] یعنی ''کیا ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی ایک بات کو سنے اور پھر اسے یاد نہ رکھے؟'' کیا ایسے انسان کے لیے اڑھائی سو حدیث کا یاد رکھنا کوئی مشکل امر تھا؟

ان تمام باتوں سے ظاہر ہے کہ احادیث کا زبانی یاد رکھنا کوئی ایسا کام نہ تھا جس کے وہ لوگ عادی نہ ہوں۔ بلکہ ان کے لیے یہ ایک معمولی سی بات تھی۔ اس لیے تحریری یادداشتیں اگر موجود بھی تھیں تو محدثین نے معتبر روایت کو ہی مانا ہے۔ اور تحریر کی تائید بھی

جب تک روایت سے نہ ہو یا کم از کم تحریر کے متعلق روایت نہ ہو اسے کوئی وقعت نہیں دی۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو چھ لاکھ حدیث یاد تھی اور انہوں نے ایک کو بھی لکھنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ بلکہ کئی لوگ اپنی لکھی ہوئی حدیثوں کا آپ کے حافظہ سے مقابلہ کر کے اپنی تحریری یادداشتوں کو درست کیا کرتے تھے۔

ان تمام باتوں سے جو اوپر بیان کی گئی ہیں یہ ثابت ہوتا ہے کہ حدیث میں جھوٹ کی ملاوٹ صحابہ کے وقت تک یعنی پہلی صدی ہجری کے اختتام تک ہرگز نہیں ہوئی بلکہ جب صحابہ کل اس دنیا سے گزر گئے اور اکثر تابعین بھی انتقال کر چکے تو اس وقت جھوٹی حدیثوں کا بننا شروع ہوا۔ مگر اس خطرہ کو فی الفور علماء نے محسوس کر کے جمع حدیث کا کام شروع کر دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد جمع حدیث کا شوق:

پس یہ ظاہر ہے کہ جمع حدیث کا کام ایک حد تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ کئی صحابہ اس وقت اس کام میں نہایت سرگرمی سے مصروف تھے کہ آپ کی احادیث کو یاد کریں اور دوسروں تک پہنچائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد جمع حدیث کا کام اور بھی زیادہ شوق اور دلچسپی سے کیا جانے لگا۔ جیسا کہ میں نے مثالیں بیان کر کے دکھایا ہے کہ کس طرح ایک ایک حدیث کی خاطر بعض صحابہ نے بڑی بڑی مشقتیں اٹھا کر لمبے لمبے سفر کیے اور شام اور مصر تک

پہنچے۔ اصل میں یہ سب کوششیں حدیث کے جمع کرنے کے لیے ہی تھیں۔

یہ بھی دکھایا جاچکا ہے کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں تحریری یادداشتیں حدیثوں کی لکھ لیا کرتے تھے اور آپ کی وفات کے بعد احادیث کا تحریر میں لانا اور بھی زیادہ ہوگیا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے وقت میں زکوٰۃ کے متعلق تمام احکام لکھے ہوئے تھے۔ جیسا کہ انس رضی اللہ عنہ کی حدیث سے پایا جاتا ہے کہ آپ انہی احکام کی نقل کر کے عاملوں کو بھیجا کرتے تھے۔ پس جب ہم یہ کہتے ہیں کہ جمع حدیث کا کام ایک سو سال کے بعد شروع ہوا تو اس وقت نہ تو ہمارا یہ منشا ہوتا ہے کہ اس سے پہلے حدیث کی حفاظت کا کوئی سامان نہ تھا اور نہ ہی یہ منشا ہوتا ہے کہ اس سے پہلے محدثین موجود نہ تھے۔ جو حدیثوں کو جگہ جگہ تلاش کر کے جمع کرتے اور نہ ہی یہ منشا ہوتا ہے کہ اس سے پہلے حدیث کو لکھا جانا ثابت نہیں۔ بلکہ اس وقت جمع حدیث سے ہمارا منشا تدوین حدیث ہوتا ہے۔ یعنی احادیث کا کتابوں میں ابواب کی تقسیم اور ترتیب کے ساتھ لکھا جانا۔ سو انہی آخری معنوں میں جمع حدیث کا کام پہلی صدی ہجری کے آخر پر یا اس کے بعد شروع ہوا اور اس کی تکمیل حضرت امام محمد بن اسماعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کی۔ جمع حدیث کے ان دو مفہوموں کو عمداً یا غلطی سے گڑبڑ کر دینے سے حدیث کی صداقت پر بہت سے اعتراض پیدا ہوئے ہیں کیونکہ ایک طرف تو کہہ دیا جاتا ہے کہ جمع حدیث کا کام پہلی صدی ہجری کے بعد شروع ہوا اور پھر مراد اس سے یہ لی جاتی ہے کہ گویا اس سے پہلے حدیث کو نہ لوگ اکٹھا کیا کرتے تھے نہ اس کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اور نہ ہی اس کی

حفاظت کا کوئی سامان تھا۔ پس سب سے اول یہ ضروری ہے کہ جمع حدیث کے ان دو مفہوموں کو اچھی طرح سے سمجھ لیا جائے اور ان کو الگ الگ رکھا جائے اور اس بات کو دل میں بٹھا لیا جائے کہ امام مالک کی مؤطا اور امام بخاری کی صحیح سے پہلے بھی حدیث کو جمع کیا جاتا تھا اور اس کی حفاظت کے سامان موجود تھے اور اس کے ساتھ درس وتدریس کا سلسلہ جاری تھا۔

جمع حدیث کے پانچ مرحلے:

پہلا مرحلہ: خود زمانہ نبوی ہے

غور سے دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جمع حدیث کا کام پانچ مرحلوں میں سے ہو کر گزرا ہے۔ سب سے اول مرحلہ اس کا زمانہ نبوی ہے۔ اس بات کو میں ثابت کر چکا ہوں کہ آنحضرت ﷺ کی زندگی میں بہت سے صحابی خاص توجہ اور شوق سے آپ کے اقوال کو جمع کرتے اور آپ کے ہر ایک فعل کو نظر غور سے دیکھ کر یاد رکھتے تھے۔ یہی سب سے پہلے محدثین تھے۔ ان میں سب سے بڑھ کر شوق رکھنے والے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تھے۔ جن کا شوق جمع حدیث کا اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ آپ حتی الوسع ہر وقت آنحضرت ﷺ کے ساتھ لگے رہتے اور جمع حدیث کے سوائے آپ کا کوئی شغل نہ تھا۔ آنحضرت ﷺ نے آپ کے لیے دعا بھی کی تھی۔ جس کے بعد حدیث کو یاد رکھنے میں خدا تعالیٰ نے آپ کو خاص قوت بخشی تھی۔ آپ کے علاوہ بعض اور صحابی ایسے تھے جن کو

آپ کے ساتھ تعلقات کی وجہ سے جمع حدیث کا خاص موقعہ حاصل تھا۔ جیسے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ جو کئی سال تک آپ کے خادم رہے۔ اگرچہ صدیقہ کے سوا اور بھی ازواج مطہرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تھیں مگر جو قابلیت اللہ تعالیٰ نے صدیقہ کو جمع اور حفاظت حدیث کے لیے دی تھی وہ اوروں میں نہیں پائی جاتی تھی۔ آپ کو ہزار ہا شعر ایام جاہلیت کے شعرا کے یاد تھے اور آپ کا حافظہ نہایت قوی تھا اور علم سے خاص دلچسپی اور محبت تھی۔ ایسا ہی بعض اور صحابی تھے جن کو خداداد قابلیت کے علاوہ موقع بھی ایسا مل گیا تھا کہ وہ جمع اور حفاظت حدیث کا کام کرتے تھے۔ جیسے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما۔ یہ دونوں نوجوان علم دین میں خاص دلچسپی رکھتے تھے اور بہت سی احادیث انہوں نے جمع کیں اور لوگوں تک پہنچائیں۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بھی جمع حدیث کا کام کیا کرتے تھے اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ حدیثوں کو لکھ بھی لیا کرتے تھے۔ ایسا ہی کئی اور صحابی تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں حدیثوں کے یاد رکھنے میں بہت شوق ظاہر کرتے تھے اور یہ کام جو وہ کر رہے تھے دراصل جمع حدیث کا بنیادی پتھر تھا۔

دوسرا مرحلہ: زمانہ صحابہ ہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد جمع حدیث نبوی کا دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ علاوہ ان چند صحابیوں کے جو آپ کی زندگی میں ہی جمع حدیث کا کام کرتے تھے ہزار ہا اور صحابہ تھے اور ان میں سے بہت سے ایسے تھے جو کوئی نہ کوئی ایسی حدیث یاد

رکھتے تھے جو عام طور پر شہرت یافتہ نہیں تھی۔ پس اس مرحلہ پر جمع حدیث کے لیے یہ ضروری تھا کہ ان تمام سرچشموں سے حدیث کو اکٹھا کیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک مشکل کام تھا مگر ضروریات زمانہ نے اس کو کئی طرح سے آسان کر دیا تھا۔

1. سب سے اول جیسا کہ ہم پہلے بھی دکھا چکے ہیں۔ ہر ایک صحابی جو کسی حدیث کو یاد رکھتا تھا وہ اسے اپنا مقدس فرض سمجھتا تھا کہ اسے دوسروں تک پہنچا دے۔ کیونکہ ان کو یہ حکم دیا گیا تھا [لِيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ] آنحضرت ﷺ کی وفات کے تھوڑے دن بعد مخبر صادق کی پیشگوئی کے مطابق صحابہ دور دراز ملکوں میں پھیل گئے تھے اور ہر جگہ انہوں نے حدیث کا چرچا پھیلا دیا تھا اور جو جو احادیث ان کو معلوم تھیں وہ دوسروں تک پہنچا دیں تھیں۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں احادیث کی تدریس کا سلسلہ شام و مصر وغیرہ ممالک میں پھیل گیا تھا۔ یہاں یہ سلسلہ نسلاً بعد نسل اس وقت تک جاری رہا جب تدوین حدیث کا وہ زمانہ پہنچا کہ محدثین نے جا بجا پھر کر کل احادیث کو کتابوں میں اکٹھا کر دیا۔

2. دوم آنحضرت ﷺ کے بعد خلفاء کے زمانے میں کئی صحابی ایسے تھے جنہوں نے آنحضرت ﷺ کے کسی قول کی بنا پر بعض حقوق طلب کئے اور ان حقوق کے دیا جانے یا ان کے انکار کے وقت آپ کی بہت سی احادیث کی تصریح ہوگئی اور وہ عام طور پر شہرت پا گئیں۔ مثلاً مغیرہ رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث کی بنا پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بعض حقوق طلب کیے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے گواہ طلب کیا اور

جب آپ کا اطمینان ہوگیا کہ واقعی یہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے تو آپ نے وہ حقوق اسے عطا فرمادیئے۔ پس اس طرح پر یہ حدیث عام شہرت پا گئی۔ اسی طرح بہت سی حدیثیں جن کا علم پہلے چند اشخاص تک محدود تھا عام طور پر شائع ہوتی اور پھیلتی رہیں اور علم حدیث کے مجموعہ میں شامل ہوتی گئیں۔

❸ سوئم نئی نئی ضرورتیں جو مسلمانوں کی روز بروز بڑھتی ہوئی تعداد میں پیش آتی تھیں بہت سی حدیثوں کی اشاعت کا موجب ہوگئیں۔ کیونکہ جب کبھی کوئی مقدمہ یا تنازعہ یا کوئی امر فیصلہ طلب پیش ہوتا تو قرآن کریم کے بعد سب سے پہلے حدیث کی طرف ہی صحابہ رجوع کرتے تھے۔ اور جہاں امر پیش آمدہ پر کوئی حدیث پوری پوری منطبق نہ ہوتی تو اس کے قریب قریب کوئی حدیث تلاش کی جاتی اور اس پر قیاس کر کے امر پیش آمدہ کا فیصلہ کیا جاتا۔ صاف ظاہر ہے کہ اس صورت میں احادیث کی اچھی طرح پڑتال کی جاتی ہوگی تاکہ عین مطابق واقعہ کوئی حدیث آنحضرت ﷺ کی مل جائے اور آپ کے فیصلہ کے مطابق فیصلہ ہوجائے۔ جو صحابہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں جمع حدیث میں شہرت رکھتے تھے اول ان سے مشورہ لیا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی باوجود نوجوان ہونے کے محض ان کے علم قرآن اور حدیث کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت عزت کیا کرتے تھے اور ایسے معاملات ان سے دریافت کرلیا کرتے تھے۔

۴ چہارم ضروریات اور نئے پیش آمدہ امور کو الگ چھوڑ کر صحابہ تلاش حدیث میں سرگرم رہتے تھے کیونکہ وہ اس بات کو پسند نہ کرتے تھے کہ آنحضرت ﷺ کے کوئی الفاظ آئندہ نسلوں کو پہنچنے سے رہ جائیں۔ چنانچہ جہاں کہیں کسی حدیث کی روایت کا ذکر سنتے تھے فوراً اس جگہ پہنچ کر بعد تحقیق اس حدیث کو اپنے علمی ذخیرہ میں شامل کر کے دوسروں تک پہنچاتے تھے۔ دراصل صحابہ کے زمانہ میں جمع حدیث کے لیے اول ان حدیثوں کی اشاعت ضروری تھی تاکہ عام طور پر معلوم ہو کر وہ حدیثیں محدثین کے ذخیرہ علم میں داخل ہو سکیں۔

۵ پنجم آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد کثرت سے لوگ اسلام میں داخل ہوئے اور ان میں سے بہت سے اس بات کی تلاش میں لگے رہتے تھے کہ انہیں اس نبی ﷺ کے کچھ حالات معلوم ہو جائیں جس کے زمانہ کو پا کر وہ اسلام اور آپ کی صحبت سے محروم رہے۔ ایسا ہی دین اسلام کے متعلق بھی وہ پوری واقفیت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اور یہی حال اس نئی اسلامی نسل کا تھا جس کا زمانہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ سے اس قدر ملا ہوا تھا؛ مگر اس مبارک زمانہ کو انہوں نے نہ پایا تھا۔ یہ تمام لوگ اس تلاش میں رہتے تھے کہ کسی صحابی سے مل کر اس سے حالات سنیں، اس ذریعہ سے حدیث کا علم اور بھی اشاعت پاتا رہا۔ پھر جوں جوں صحابہ دنیا میں گزرتے گئے ان لوگوں کا اشتیاق احادیث کا علم حاصل کرنے اور ان کو محفوظ رکھنے اور پھیلانے کا اور

بھی بڑھتا گیا۔ ان تمام باتوں سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اکثر وہ احادیث جو صحابہ کے علم میں تھیں تابعین کو پہنچ گئیں۔

ششم وہ صحابی جن کے پاس احادیث کا ذخیرہ زیادہ تھا جیسے ابو ہریرہ، انس بن مالک، ابن عباس رضی اللہ عنہم وغیرہ وہ تدریس کے طور پر مشتاق طالبعلموں کو حدیثیں سنایا کرتے تھے۔ اور صحابہ کے زمانہ میں ہی ایسے مقامات پر حدیث کی بڑی بڑی درسگاہیں بن گئی تھیں جہاں باقاعدہ حدیث کی اشاعت ہوتی تھی اور دور دور سے سننے والے جمع ہوتے تھے۔ چنانچہ آٹھ سو آدمی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے حدیث میں شاگرد تھے۔ ان درسگاہوں کا قائم ہونا جمع حدیث کے دوسرے مرحلہ کا اختتام تھا اور یہی تیسرے مرحلہ کی ابتدا تھی۔

تیسرا مرحلہ: زمانہ تابعین اور درسگاہوں میں تدریس حدیث

تیسرا مرحلہ جمع حدیث میں اس وقت شروع ہوتا ہے جب صحابہ کا زمانہ گزر کر کل احادیث اکابر تابعین کے ہاتھ میں آ چکی تھیں۔ پہلی صدی ہجری کے اختتام سے پہلے کل صحابہ اس دنیا سے گزر چکے تھے۔ حدیث کی درسگاہیں صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں ہی قائم ہو چکی تھیں۔ اور اب اس تیسرے مرحلہ پر جمع حدیث کے لیے اس طرح پر تلاش کی ضرورت نہ رہ گئی تھی جیسے صحابہ کے وقت میں تھی۔ کیونکہ صحابہ کے زمانہ تک نئی نئی احادیث اشاعت پاتی رہتی تھیں۔ مگر اب صرف وہی احادیث آگے پہنچائی جاتی تھیں جو

صحابہ رضی اللہ عنہم کے ذریعہ تابعین کو پہنچ چکی تھیں۔ پس عموماً حدیث کی تلاش ان درسگاہوں تک ہی محدود ہوگئی تھی جہاں علم حدیث کا چرچا ہوتا تھا اور بہت کم ایسی حدیثیں تھیں جو ان درسگاہوں میں نہ آ گئی ہوں۔ اس طرح پر جہاں تک زبانی سلسلہ روایت کی تکمیل ہوسکتی تھی ان درسگاہوں کے قائم ہونے اور ان میں علم حدیث کے پڑھایا جانے سے جمع حدیث کی ایک گونہ تکمیل ہوچکی تھی۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھا جاسکتا کہ کسی ایک درسگاہ میں کل کی کل حدیثیں مل سکتی تھیں۔ بلکہ جو احادیث کسی محدث یا تابعی نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے سن کر حفظ کر لی تھیں انہی احادیث کی اشاعت اس درسگاہ میں ہوتی تھی اور پھر سفر کے ذریعہ محدثین کے علم کی وسعت ہوتی رہتی تھی۔ علاوہ ازیں اس زمانہ میں حدیث کا لکھنا پہلے کی نسبت زیادہ مروج ہوگیا تھا اور جہاں محدثین درسگاہوں میں سنایا کرتے تھے بہت سے لوگ ان کو لکھ لیا کرتے تھے اور جو حافظہ پر پورا بھروسہ کر سکتے تھے وہ ان کو وہیں یاد کر لیا کرتے تھے۔

امام زہری (جو 50 ہجری میں پیدا ہوئے اور 124 ہجری میں وفات پائی) کی تالیفات کے متعلق لکھا ہے کہ گدھوں اور گھوڑوں پر لاد کر لائی گئیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے بھی پہلی صدی ہجری کے اختتام کے قریب یہ احکام نافذ کئے تھے کہ احادیث لکھ لی جایا کریں اور علمائے حدیث حدیثوں کی تدریس کے سلسلہ کو وسیع کریں تاکہ جو لوگ علم حدیث سے واقف نہیں وہ بھی واقف ہوجائیں تاکہ اس طرح پر سلسلہ روایت حدیث اور جمع حدیث میں کوئی خلل نہ آئے۔ ایسا ہی آپ نے عمرہ کے مسائل

جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی تھے لکھوا لئے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس زمانہ میں حدیثیں صرف متفرق طور سے لکھ لی جایا کرتی تھیں۔ وہ کتابوں کی صورت میں نہ تھیں۔ نہ تحریر کے ذریعہ ان کی اشاعت ہوتی تھی۔ بہرحال حدیث کا لکھنا عام طور پر مروج ہو گیا تھا اور یہ تیسرے مرحلہ کا اختتام تھا اور یہی چوتھے مرحلے کی ابتدا تھی۔

چوتھا مرحلہ: حدیث پر تصنیفات

دوسری صدی ہجری کے نصف کے قریب حدیث کے لکھا جانے نے ایک اور رنگ پکڑ لیا اور بجائے متفرق مسودات کے جن کی اشاعت بحیثیت ایک کتاب ہونے کے نہ ہو سکتی تھی مستقل کتابیں حدیث پر لکھی جانی شروع ہو گئیں۔ اس زمانہ تک محض تحریری مسودہ اس بات کو ثابت کرنے کیلئے کافی نہ تھا کہ واقعی ایک حدیث صحیح اور قابل اعتبار ہے۔ بلکہ یہ ضروری تھا کہ معتبر سلسلہ رواۃ سے حدیث کو کسی مشہور صحابی تک پہنچایا جائے اور ان تمام راویوں کے نام درجہ بدرجہ ظاہر کئے جائیں جن کے ذریعہ حدیث اس بیان کرنے والے تک پہنچی تھی۔ اس لیے ان کتابوں میں بھی پورا پورا سلسلہ راویوں کا دیا جاتا تھا۔ یہ کتابیں اشاعت کے بعد یہ وقعت رکھتی تھیں کہ ان کی احادیث کا حوالہ دیا جائے۔ کیونکہ اس زمانہ میں تحریر کا رواج عام ہو کر کتابوں کے نسخے کثرت سے شائع ہو سکتے تھے۔ سب سے پہلے جس شخص نے حدیث کی کتاب لکھی وہ امام عبدالملک بن عبدالعزیز ابن جریج تھے جو ابن جریج کے نام سے مشہور ہیں۔ اور بعض کے نزدیک

سب سے پہلے حدیث کی کتاب ربیع بن صبیح نے لکھی تھی۔ اور تیسری روایت ہے کہ سب سے اول سعید ابن ابی عروبہ تھے۔ یہ تمام محدثین دوسری صدی ہجری کے نصف کے قریب فوت ہوئے جس سے قیاس ہوسکتا ہے کہ حدیث کا کتابوں میں لکھا جانا دوسری صدی ہجری کے نصف سے پہلے شروع ہو چکا تھا۔ ان کے بعد حدیث کے بڑے معتبر امام حضرت امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ تھے جن کی کتاب مؤطا آج تک حدیث میں سند مانی گئی ہے۔ یہ کتاب اہل حجاز کی احادیث پر مبنی تھی۔ اور علاوہ احایث آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس میں صحابہ اور تابعین کے اقوال اور فتاویٰ بھی درج ہیں۔ مختلف مقامات میں مختلف آئمہ حدیث نے اس زمانہ میں کتابیں لکھیں۔ چنانچہ ابن جریج نے مکہ میں، امام مالک نے مدینہ میں، سفیان بن عیینہ نے بھی مدینہ میں، عبداللہ بن وہب نے مصر میں، معمر اور عبدالرزاق نے یمن میں، سفیان الثوری اور محمد بن فضیل نے کوفہ میں، حماد بن سلمہ اور روح بن عبادہ نے بصرہ میں، ہشیم نے واسط میں اور عبداللہ بن مبارک نے خراسان میں حدیث پر کتابیں تصنیف کیں۔

پانچواں مرحلہ: جمع حدیث کے کام کی تکمیل

یہ تصنیفات جن کا ذکر اوپر ہوا جمع حدیث کا چوتھا مرحلہ ہیں۔ اصل میں تدوین حدیث کا کام شروع ہوگیا تھا لیکن ابھی تک یہ کام تکمیل کے درجہ کو نہیں پہنچا تھا۔ چوتھے مرحلہ پر جس قدر تصانیف لکھی گئیں ایک تو ان کے اغراض محدود تھے یعنی ان میں ہر قسم

کی احادیث نہ پائی جاتی تھیں۔ صرف خاص مقاصد کو مدنظر رکھ کر یہ تالیفات کی گئی تھیں۔ اور دوسرا ان میں وہی احادیث ان مضامین کے متعلق جمع کی گئی تھیں جو اس خاص حصہ (ملک) میں مروج تھیں۔ مثلاً مؤطا کو ہی لو۔ اس میں صرف اہل حجاز کی احادیث ہیں اور ان میں سے بھی صرف وہ احادیث جو عمل کے متعلق ہیں مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ کے احکام کے متعلق اور اس قسم کی احادیث جیسے آنحضرت ﷺ کی سیرت کے متعلق یا مغازی کے متعلق یا تفسیر قرآن کے متعلق وہ اس میں جمع نہیں کی گئیں۔ پس باوجود تدوین کے شروع ہوجانے کے جمع حدیث کا کام ابھی کمال کو نہ پہنچا تھا۔ بلکہ یہ کمال اسے پانچویں مرحلہ پر حاصل ہوا۔ جب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جمع حدیث کا کام شروع کیا اور اس کو ہر پہلو سے مکمل کر کے دکھایا۔ امام محمد بن اسماعیل جو بخاری کے نام سے مشہور ہیں کیونکہ بخارا ان کا اصل وطن تھا۔ اس وقت کے قریب قریب پیدا ہوئے جو امام مالک کی وفات کا وقت تھا۔ اور جمع حدیث کا شوق ان کو چھوٹی عمر میں پیدا ہوگیا تھا۔ اور تیسری صدی ہجری کی ابتدا میں یہ کام انہوں نے شروع کر دیا اور کتاب صحیح بخاری تالیف کی۔ ان کی وفات 256ھ ہجری میں ہوئی۔ یعنی تیسری کے نصف کے قریب۔ ایسا ہی اس زمانہ کے قریب ان کے شاگرد مسلم نے جمع حدیث کا کام شروع کیا۔ اور صحیح مسلم کو تالیف کیا جس کا مرتبہ صرف صحیح بخاری سے دوسرے درجہ پر ہے۔ پھر ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ یہ تینوں کتابیں اگرچہ مؤطا، صحیح بخاری اور مسلم کے مرتبہ کو نہیں پہنچتیں مگر ان سے دوسرے درجہ پر معتبر و کتابیں سمجھی گئی

ہیں۔ان کے مصنفوں نے ہر ایک جگہ خود سفر کر کے کل احادیث معتبر کو جمع کیا اور اپنی ساری ساری زندگیاں اسی کام کے لیے وقف کر دیں۔ یہ پانچواں مرحلہ جمع حدیث کا تھا۔ جب یہ کام تکمیل کو پہنچ گیا اور معتبر احادیث کا ذخیرہ کتابوں کی صورت میں جمع ہو گیا۔

ان پانچوں مرحلوں کے بغیر جمع حدیث کا کام نامکمل رہتا:

اس تمام بحث سے یہ امر واضح ہو گیا کہ جمع حدیث کی بنیاد تو خود آنحضرت ﷺ کے وقت میں ہی رکھی گئی تھی۔مگر اس عمارت کی تکمیل امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ سے ہوئی۔اور اگر حدیث کی اصلیت پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ بغیر ان پانچ مرحلوں سے گزرنے کے یہ کام تکمیل پذیر نہ ہو سکتا تھا۔ یہ پانچ مرحلے دراصل پانچ سیڑھیوں کی طرح تھے اور ہر ایک مرحلہ گویا دوسرے مرحلہ کے لیے تیاری کا سامان مہیا کر رہا تھا۔ سب سے اول تو آنحضرت ﷺ کا زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں اگرچہ بعض صحابہ نے خصوصیت سے حفظ حدیث کا کام شروع کر دیا تھا مگر بہت سی احادیث ایسی تھیں جن کا علم خاص خاص صحابہ کو تھا۔آپ کی وفات کے بعد یہ موقعہ پیش آیا کہ ایسی تمام احادیث عام اشاعت پا گئیں اور خاص خاص لوگوں نے انہیں محفوظ کر لیا۔دوسری طرف جن صحابہ کو زیادہ حدیثیں یاد تھیں انہوں نے اس زمانہ میں بذریعہ تدریس یہ احادیث آئندہ نسل کو پہنچانی شروع کیں اور جہاں جہاں صحابہ پھیل گئے تھے اس جگہ تدریس حدیث کے مرکز قائم ہو گئے۔اس کے بعد تیسرا زمانہ تابعین کا آیا جب حدیث کے علم کا بذریعہ

تدریس عام رواج ہوگیا۔ اور مزید برآں علاوہ حفظ حدیث کے اس کی یادداشتیں لکھی جانی شروع ہوگئیں۔ اور یادداشتوں کی صورت میں نہ کتابوں کی صورت میں حدیث کی تحریر کا رواج عام ہوگیا۔ اور جو لوگ جمع حدیث کے مشتاق تھے وہ ان درسگاہوں میں حاضر ہوکر جب حدیثوں کو سنتے تو ان میں سے اکثر ان کو ضبط تحریر میں لے آتے۔ اس تحریر کے رواج سے جمع حدیث کا چوتھا مرحلہ آ پہنچا جب بجائے الگ الگ یادداشتوں کے کتاب کی صورت میں ترتیب پا کر حدیثوں کا لکھا جانا شروع ہوگیا۔ پھر اس کے بعد پانچواں مرحلہ آ پہنچا۔ جب بجائے ایک خاص مقام سے حدیثیں جمع کرنے کے یا بجائے ایک خاص مضمون پر حدیثیں جمع کرنے کے جامع کتابیں حدیث پر لکھی جانی شروع ہوئیں۔ اس طرح دوسو سال کے عرصہ میں اس عمارت کی تکمیل ہوئی اور جمع حدیث کا کام ختم ہوا۔ لیکن صرف اس وجہ سے کہ اس کام کی تکمیل فی الفور نہیں ہوئی اور ایک دراز عرصہ اس میں خرچ ہوا، حدیثوں کی بے اعتباری نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلہ تک ایک قدرتی ترقی تھی۔ جس کے سوائے یہ کام احسن طور پر سرانجام نہ پاسکتا تھا۔ اور یہ پانچوں مرحلے ایک دوسرے سے ایسے وابستہ ہیں جیسے زنجیر کی کڑیاں۔

پانچواں باب

تنقید حدیث

میور اور سپرنگر کی رائے محدثین کی تنقید حدیث پر:

اب میں اس بات کو لیتا ہوں کہ تنقید حدیث کس حد تک محدثین نے کی اور کس حد تک ہم کر سکتے ہیں۔ ان میں سے پہلے سوال اول کو لیتا ہوں۔ میور اور سپرنگر اور اَور معترضین نے ان کتابوں میں معتبر احادیث کے ہونے سے انکار کیا ہے اور اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ ان محدثین نے حدیث کے جمع کرنے میں تنقید کا طریق اختیار نہیں کیا۔ میور، سپرنگر کی رائے کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے اور خود اسی رائے کا مؤید ہے۔ بخاری کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ

> ''جن اصول اور قواعد کی پیروی اس نے (یعنی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے) کی ان پر تنقید کا نام چسپاں نہیں ہوسکتا۔ وہ صرف یہ دیکھتا تھا کہ راویوں کا سلسلہ پورا ہے۔ یعنی منقطع نہیں ہوجاتا۔ اور ان راویوں کے چال چلن کو دیکھ لیتا تھا۔ اور چونکہ ایک قاعدہ اس نے یہ بھی مقرر کیا ہوا تھا کہ جو حدیث اس کے اپنے متعصّبانہ خیالات کے مطابق نہ ہو اسے ردّ کر دیتا تھا۔ اس لیے اس کے کسی حدیث کو رد کر دینے سے یہ نتیجہ کسی صورت میں نہیں نکل سکتا

کہ وہ حدیث واقعی نا قابل اعتبار ہے۔ مگر اس کی جامع دوسری مسندوں سے یہ امتیاز ضرور رکھتی ہے کہ وہ کسی خاص مذہب کا پیرو نہ تھا۔ بلکہ صرف حدیثوں کی فرضی صحت اور راویوں کی راستبازی وغیرہ پر ہی سارا دارومدار رکھا کرتا تھا۔''

ایسا ہی میور اپنے دیباچہ لائف آف محمد (ﷺ) میں لکھتا ہے:

''یہ تو ظاہر ہے کہ محدثین کسی قسم کی تنقید کو کام میں لاتے تھے۔ اور وہ بھی ایسی سختی سے کہ بحساب اوسط ہر سو حدیث میں سے انہوں نے قریباً ننانوے کو نا قابل اعتبار ٹھہرایا۔ لیکن یورپین ناظرین سخت دھوکا کھائیں گے اگر وہ یہ سمجھ لیں کہ یہ تنقید باوجود اس قدر سختی کے صحیح معنوں میں ایک کامل اور صحیح تحقیقات احادیث کی صحت کے متعلق تھی۔ محدثین کے نزدیک کسی حدیث کے قابل اعتبار ہونے کے لیے اس حدیث کے نفس مضمون کو نہ دیکھا جاتا تھا بلکہ صرف ان ناموں کو دیکھا جاتا تھا جو اس حدیث کے بیان کرنے والے ہوتے تھے۔ ان کے نزدیک صحیح احادیث کی سند پہلے کسی صحابی سے چلنی چاہئے اور پھر راویوں کے ایک لمبے سلسلے میں ہر ایک راوی کی صداقت پر اس کی بنا ہوتی تھی۔ اگر ان راویوں کی صداقت پر کوئی الزام عائد نہ ہو سکے تو حدیث قبول کرنی چاہئے۔ نفس مضمون میں کوئی بات خواہ کیسی ہی بعید از قیاس کیوں نہ پائی جاتی ہو وہ ایسی حدیث کے اعتبار کو

نہیں گرا سکتی۔ محدثین بحر تنقید میں کھلی کھلی شناوری نہ کرتے تھے۔ بلکہ اس ایک ہی قاعدہ کے غلام ہو گئے تھے اندرونی شہادت پر جرح کرنے کی ان کو قطعاً جرأت نہ تھی۔''

محدثین کے قرار دادہ اصول تنقید حدیث:

یہ دو ایسے شخصوں کی رائے ہے جن کی رائے کو اسلام کے متعلق نہایت محققانہ اور بے لوث مانا گیا ہے۔ مگر میں افسوس سے کہتا ہوں کہ ان خیالات کے ظاہر کرنے میں ان دونوں نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ ان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ جن احادیث کو محدثین نے وضعی قرار دیا ہے ان کو کس بنا پر وضعی قرار دیا ہے؟ اس میں شک نہیں کہ محدثین نے راویوں کے متعلق پوری پوری تحقیقات کرنے میں بہت ہی کوشش کی ہے۔ اور میں یہ ثابت کروں گا کہ احادیث کی صحت کو پرکھنے کے لیے اس کی ضرورت تھی؛ مگر یہ غلط ہے کہ انہوں نے اندرونی شہادت پر مطلق توجہ نہیں کی۔ بلکہ احادیث موضوعہ کے جانچنے کے لیے جو اصول انہوں نے مقرر کیے ہیں وہ قریباً سب کے سب اندرونی شہادت کے ہی متعلق ہیں۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے عجالہ نافعہ میں وضعی احادیث کی مفصلہ ذیل علامات بیان کی ہیں جنہیں نواب صدیق حسن خان نے بھی اپنی کتاب [اَلْحِطَّةُ فِيْ ذِكْرِ الصِّحَاحِ السِّتَّةِ] میں ذکر کیا ہے۔ وہ علامات حسب ذیل ہیں:

1. یہ کہ روایت تاریخ کے خلاف ہو۔ جیسا کہ کہا جائے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

نے جنگ صفین میں یوں فرمایا۔ حالانکہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں وفات پا چکے تھے۔

۲ یہ کہ راوی رافضی ہو اور جو حدیث وہ بیان کرے وہ صحابہ کے مطاعن میں ہو۔ یا راوی خارجی ہو اور اہل بیت کے مطاعن میں حدیث بیان کرے۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔ پھر اگر راوی اس حدیث کو بیان کرنے میں اکیلا ہو اور اَور کوئی راوی اس حدیث کا نہ ہو تو ایسی حدیث منکر ہے۔ اور اگر اَور لوگ بھی اس حدیث کو بیان کرنے والے ہوں تو حدیث قبول کی جائے اور اس کی مناسب توجیہ کی جائے۔

۳ ایسی حدیث بیان کرے جس کا جاننا اور اس پر عمل کرنا سب مکلفوں پر واجب ہو۔ اور راوی اس حدیث کے بیان کرنے میں اکیلا ہو۔ تو یہ مضبوط قرینہ حدیث کے جھوٹا اور موضوع ہونے پر ہے۔

۴ یہ کہ راوی کا حال اور وہ وقت جب حدیث کو بیان کیا ہے اس کے کذب پر قرینہ ہوں۔ جیسا کہ خلیفہ عباس مہدی کی مجلس میں غیاث بن میمون کے لیے واقع ہوا کہ جب وہ بادشاہ کے پاس حاضر ہوا تو بادشاہ اس وقت کبوتروں کے اڑانے میں مشغول تھا۔ جس پر غیاث نے بادشاہ کو خوش کرنے کے لیے یہ حدیث سنائی کہ [لَا سَبَقَ إِلَّا فِيْ خُفٍّ أَوْ نَصْلٍ أَوْ جُنَاحٍ] یعنی ''کوئی شرط نہیں ہونی چاہئے مگر اونٹوں (یا گھوڑوں) کی دوڑ میں اور تیر

اندازی میں اور پرندوں کے اڑانے میں۔'' مگر یہ لفظ جناح پرندوں کا اڑانا اصل میں موجود نہ تھا بلکہ غیاث نے صرف خلیفہ کو خوش کرنے کے لیے اسے بڑھا دیا تھا۔ کیونکہ خلیفہ کو کبوتر اڑانے کا شوق تھا۔

۵ یہ کہ حدیث عقل اور شرح کے مقتضیٰ کے مخالف ہو اور قواعد شرعیہ اس کو جھوٹا ٹھہراتے ہوں۔ جیسا کہ قضائے عمری اور حدیث مثل اس کے کہ [لَا تَاكُلُوا الْبَطِيْخَ حَتّٰى تَذْبَحُوْهُ] یعنی ''خربوزے کو نہ کھاؤ جب تک اسے ذبح نہ کرلو۔''

۶ یہ کہ حدیث میں کوئی قصہ کسی ایسے امر محسوس کے متعلق ہو کہ اگر درحقیقت وہ واقع ہوا ہوتا تو لاکھوں انسان اس کو نقل کرتے۔ مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ فلاں خطیب کو جمعہ کے دن ممبر پر قتل کر دیا گیا اور اس کی کھال اتار دی گئی اور اس واقعہ کو سوائے اس راوی کے اور کوئی بیان کرنے والا نہ ہو۔

۷ یہ کہ حدیث میں لفظ اور معنی رکیک ہوں۔ مثلاً الفاظ ایسے ہوں جو قواعد عربیہ کے مطابق نہیں یا معنی ایسے ہوں جو شان نبوت اور وقار رسالت کے شایاں نہیں۔

۸ یہ کہ چھوٹے سے گناہ پر سخت وعید یا تھوڑے عمل پر بڑے ثواب کے وعدوں میں افراط کا پہلو اختیار کیا گیا ہو۔ جیسے: [مَنْ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ فَلَهُ

سَبْعُوْنَ أَلْفَ دَارٍ فِيْ كُلِّ دَارٍ سَبْعُونَ أَلْفَ بَيْتٍ فِيْ كل بَيْتٍ سَبْعُونَ أَلْفَ سَرِيْرٍ عَلٰى كُلِّ سَرِيْرٍ سَبْعُونَ أَلْفَ جَارِيَةٍ]

یعنی ''جو شخص دو رکعت نماز پڑھے اس کے لیے بہشت میں ستر ہزار مکان ہوں گے۔ ہر مکان میں ستر ہزار کمرے ہوں گے ہر کمرے میں ستر ہزار تخت ہوں گے ہر تخت پر ستر ہزار لونڈیاں ہوں گی۔ بلکہ اس قسم کی کل حدیثیں خواہ وہ ثواب کے بارہ میں ہوں اور خواہ عذاب کے، موضوع سمجھی گئی ہیں۔

۹ یہ کہ چھوٹے سے عمل پر عمرہ اور حج کا ثواب بتایا گیا ہو۔

۱۰ یہ کہ نیکی کرنے والے کے لیے کئی انبیاء اور مرسلین کے ثواب کا وعدہ ہو۔

۱۱ یہ کہ خود وضع کرنے والا اقرار کرے جیسا نوح بن عصمہ کے لیے اتفاق ہوا کہ اس نے قرآن شریف کی ایک ایک سورۃ کی فضیلت میں جھوٹی حدیثیں بنائیں اور ان کو رواج دیا اور شہرت دی۔ جیسا کہ بیضاوی میں ہر ایک سورۃ کے اخیر میں ان کا ذکر ہے اور جب محدثین نے ان حدیثوں کے متعلق تحقیق شروع کی اور اسے کہا کہ ان کی سند کو صحت کو پہنچائے اور یہ بتائے کہ اس نے یہ حدیثیں کہاں سے لیں تو اس نے اقرار کیا کہ میں نے خود ہی یہ جھوٹی حدیثیں بنائی ہیں۔

محدثین نے اندرونی شہادت اور قرائن سے کام لیا:

اب معترضین اس مقام پر غور کریں کہ ان گیارہ علامتوں میں سے جو وضعی احادیث کے لیے قرار دی گئی ہیں دس علامتیں اندرونی شہادت اور قرائن کے متعلق ہیں۔ حالانکہ میور اور سپرنگر صاحبان جن کو بڑے محقق ہونے کا دعویٰ ہے وہ کہتے ہیں کہ ''محدثین کو یہ جرأت ہی نہ تھی کہ وہ قرائن کی شہادت پر یا اندرونی شہادت پر تنقید کریں۔'' اس سے بڑھ کر ان لوگوں کی جہالت کا اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے۔ جس آزادی کے ساتھ محدثین نے احادیث پر تنقید کی ہے، اس کی نظیر ہمیں دوسری جگہ نہیں ملتی۔ ان کے نزدیک دنیوی وجاہت کوئی قابل توجہ چیز نہ تھی۔ بلکہ بڑے سے بڑے آدمی کے چال چلن پر وہ اسی طرح تنقید کرتے جیسے معمولی آدمی پر اور جب ان پر یہ ثابت ہوجاتا کہ ایک شخص نے عمداً ایک لفظ بھی جھوٹا حدیث میں ڈال دیا ہے تو خواہ وہ کتنا بڑا آدمی ہوتا مگر اس کی روایت کو وہ ہرگز نہ لیتے۔ اصل بات یہ ہے کہ قرائن کی شہادت اور اندرونی شہادت پر محدثین نے اس طرح سے تنقید کی جیسے راویوں کے حالات وغیرہ کے متعلق اور یوں حدیث کو بلحاظ صحت ایسے مرتبہ پر پہنچا دیا جو عیسائیوں کی کتب مقدسہ کو بھی میسر نہیں ہوا۔ کیونکہ ان کے قبول کرنے میں نہ بروئے روایت کوئی تنقید کی گئی اور نہ بروئے درایت۔ اب میں یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ کیوں محدثین نے راویوں کی جرح اور تعدیل میں اس قدر کوشش کی ہے۔ اور اس سے حدیث کی صحت کے متعلق کیا کیا نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

روایت کی تنقید مزید احتیاط کے لیے تھی:

جاننا چاہئے کہ محض اندرونی شہادت یا قرائن کی شہادت پر کوئی جرح وارد نہ ہونے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ حدیث واقعی آنحضرت ﷺ کی ہے کیونکہ بہتیری احادیث ایسی وضع ہوسکتی تھیں اور ہوئیں جن کا مفہوم مخالف عقل نہ تھا۔ مگر محض اس وجہ سے کہ ایک بات مخالف عقل نہیں یہ سند نہیں ملتی کہ وہ بات واقعی صحیح بھی ہے اور اس کے راوی نے سچ بیان کیا ہے۔ کیونکہ ہر ایک جھوٹی بات مخالف عقل نہیں ہوتی بلکہ جن لوگوں کو آج کل عدالتوں میں شہادتوں کے سننے کا اتفاق ہوا ہوگا وہ جانتے ہیں کہ جھوٹی شہادتیں اس قدر احتیاط سے دی جاتی ہیں کہ قرائن اور اندرونی شہادت کی رو سے وہ سچی شہادت سے بھی بڑھ جاتی ہیں اور ہزار ہا مقدموں کا لائق جج انہی شہادتوں پر فیصلہ کرتے ہیں۔ اس لیے محدثین نے وہی طریق اختیار کیا جو ہر ایک محقق منقد کو اختیار کرنا چاہیے۔ یعنی جب انہوں نے دیکھا کہ ایک حدیث قرائن اور اندرونی شہادت سے وضعی ثابت نہیں ہوتی تو انہوں نے اتنی بات پر اکتفا کر کے اسے سچ نہیں سمجھ لیا اور اپنی کتاب میں داخل نہیں کیا۔ بلکہ پھر پورا زور اس امر کی تحقیق پر لگایا کہ وہ لوگ جن کی روایت سے وہ حدیث ان تک پہنچی ہے کس قسم کے لوگ ہیں؟ آیا وہ ایسے لوگ ہیں جن کی سچائی اور راستبازی اور ان کے حافظہ پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے؟ یا ان کا جھوٹ بولنا یا اکثر غلطی کرنا وغیرہ امور ثابت ہیں؟ جن سے ان کی باتیں بھی قابل اعتبار نہیں رہ جاتیں۔ جن مراحل کو طے کر کے حدیث صحابہ سے اس زمانہ کے محدثین تک پہنچی تھی۔ جب کتابیں لکھی جانی شروع ہوئیں

ان پر نظر کر کے ضروری تھا کہ جا معین حدیث راویوں کے معتبر یا غیر معتبر یا معروف یا مجہول الحال ہونے پر پوری بحث کرتے اور بغیر اس بحث کے وہ کبھی صحیح نتیجہ تک نہ پہنچ سکتے تھے۔

علم جرح اور تعدیل کی بنیاد ابتدا سے رکھی گئی:

علاوہ ازیں علم جرح (گواہ کو بے اعتبار ثابت کرنا) اور تعدیل (اس کو صادق اور قابل اعتبار ثابت کرنا) جو علم حدیث کی ایک نہایت ضروری فرع ہے، اس کی بنیاد بھی آنحضرت ﷺ کے وقت میں پڑ چکی تھی۔ اور خود آنحضرت ﷺ نے یہ اجازت دی تھی کہ شہادت کے پرکھنے کے لیے گواہ کے چال چلن کو زیر بحث لایا جا سکتا ہے۔ اور قرآن کریم بھی فرماتا ہے کہ ﴿اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا﴾ [الحجرات: 6:49] یہ تو صحابہ کے زمانہ کا حال تھا اور جب تابعین کے زمانہ کو دیکھتے ہیں تو اس زمانہ میں ہر راوی کے متعلق جرح اور تعدیل کرنے کا رواج عام ہو گیا تھا۔ اور اسی زمانہ میں مشہور محدث اور امام حدیث یحییٰ بن سعید بن قطان اور شیبہ بن حجاج نے اس علم کے متعلق تحقیقات کر کے واقعات کو جمع کیا۔ اس تحقیقات میں جو رجال حدیث کے متعلق کی جاتی تھیں کسی شخص کو باہر نہ چھوڑا جاتا تھا۔ بلکہ ہر ایک کی صداقت اور اس کے چال چلن اور اس کی قوت ضبط وغیرہ کو زیر بحث لایا جاتا تھا۔ اور یہ کسی صورت میں ممکن نہیں کہ اگر تابعین کو یا ان کے بعد آنے والی نسلوں کو ایک صحابی کے متعلق بھی کسی حدیث کا وضع کرنا ثابت ہو جاتا تو وہ صحابہ پر وہی جرح نہ کرتے جو دوسروں پر انہوں نے کی۔ مگر اصل بات یہ

ہے کہ خود صحابہ کو اور پھر ان سے بعد ہر ایک نسل کو یہ یقین کامل تھا کہ کسی صحابی نے عمداً کوئی جھوٹی حدیث بنا کر مشہور نہیں کی اور اسی لئے تمام محققین کا اس بات پر اتفاق ہو گیا کہ صحابی پر جرح کی ضرورت نہیں۔ بلکہ جب ایک حدیث ایک مشہور صحابی تک راویوں کے معتبر سلسلہ سے پہنچ جائے تو پھر اسے صحیح اور قابل اعتبار مان لیا جائے۔ اگر یہ خصوصیت صحابیوں کو نہ ہوتی کہ ان میں کسی نے کوئی حدیث جھوٹی نہیں بنائی تو محدثین ان کو بھی علم الجرح والتعدیل کے نیچے اسی طرح لاتے جس طرح وہ تمام دوسرے راویان حدیث کو لائے۔

کن حالات میں روایت کو قبول نہ کیا جاتا تھا:

اس تمام بحث سے یہ قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے کسی صحابی نے کبھی کوئی حدیث وضع نہیں کی۔ پس محدثین صرف انہی حدیثوں کو لیتے تھے جن کی روایت معتبر راویوں کے ذریعہ کسی مشہور صحابی تک پہنچے اور ان کا سب سے پہلا فرض یہ تھا کہ وہ دیکھیں کہ آیا جن لوگوں نے اس حدیث کو بیان کیا ہے وہ اعتبار کے قابل گواہ ہیں یا نہیں۔ جن مراحل کو طے کر کے علم حدیث دوسری صدی ہجری کے آخر پہنچ گیا تھا، ان سے یہ تحقیقات آسان ہو گئی تھیں۔ کیونکہ ہر ایک مرحلہ پر جو آئمہ حدیث حدیث کو لیتے اور پھر اسے آگے پہنچاتے تھے وہ پچھلے راویوں کو جرح و تعدیل کے ماتحت لانے کے بعد اور اس بات کو سمجھ کر کہ واقعی یہ حدیث قابل اعتبار ہے اسے قبول کرتے اور آگے پہنچاتے تھے۔ علاوہ ازیں ابتدائی زمانہ تابعین میں آئمہ حدیث جو حدیث کے محافظ اور

سکھلانے والے تھے تھوڑے اور مشہور آدمی تھے۔ اور ان کے حالات صدق اور حفظ وغیرہ کے متعلق بھی مشہور تھے۔ کیونکہ وہ پہلے زیر تنقید آ چکے تھے۔ اس لیے محدثین نے جب دوسری صدی ہجری کے اخیر پر حدیث کو کتابوں میں لکھنا شروع کیا تو انہوں نے سب سے پہلی یہ احتیاط کی کہ جس راوی کے حالات معلوم نہیں اس کی حدیث کو قبول نہ کیا جائے۔ کیونکہ اس کے صدق پر یا حافظہ پر کوئی جرح نہ ہوسکتی تھی۔ ایسے ہی اور بھی کئی ایک قواعد اس علم کے انہوں نے مقرر کئے جن سے راوی کے اعتبار کا اندازہ کیا جاتا۔ اگر یہ ثابت ہوجائے کہ اس نے کوئی حدیث عمداً وضع کی ہے تو ایسے شخص کی روایت کو بالکل ناقابل اعتبار مانا جاتا۔ ایسا ہی اگر کسی راوی کے متعلق معلوم ہو کہ وہ حدیث کی روایت میں اکثر غلطی کرتا ہے تو اس کا ضبط اور حافظہ ناقابل اعتبار مانے جاتے۔

راوی کی صداقت اور اس کی راستبازی کو خصوصا بہت باریک نظر سے تحقیق کیا جاتا۔ ایسا ہی یہ بھی دیکھا جاتا کہ آیا ایک شخص جو روایت کرتا ہے اس کا اس شخص سے جس سے وہ روایت کرتا ہے ملنا بھی ممکن تھا یا نہیں۔ بلکہ جن محدثین نے اس سے بھی زیادہ احتیاط کی ہے انہوں نے یہ ضروری سمجھا ہے کہ واقعی ایک کے دوسرے سے ملنے کا ثبوت ہونا چاہئے اور بغیر اس کے حدیث قبول نہیں کی جائے گی۔ چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تحقیقات میں اس بات کو ضروری سمجھا ہے۔ ایسا ہی راوی کے حافظہ وغیرہ کے متعلق شہادت لی جاتی۔ ان اصول اور قواعد کی رو سے راوی اور اس کی روایت کو معتبر یا غیر معتبر قرار دیا جاتا تھا۔ اور ہر ایک شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ یہ تحقیق وتنقید کا پہلو جو محدثین

نے اختیار کیا کس قدر مشکل ہے۔

اس میں شک نہیں کہ وہ سارے سامان جن کے ذریعے یہ عظیم الشان تحقیق اور تنقید کا کام تکمیل کو پہنچ سکتا تھا پہلے سے موجود تھے۔ کیونکہ جمع حدیث کے ہر مرحلہ پر انہی تمام اصول اور قواعد سے کام لیا گیا تھا اور جس طرح علم حدیث ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتا رہا اسی طرح اس کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم تنقیدی بھی پہنچتے رہے۔ صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں آئمہ حدیث کی تعداد ایسی زیادہ نہ تھی اور ان کے حالات بھی مشہور ومعروف تھے۔ البتہ بعد کے زمانہ میں حدیث کے راویوں اور حدیث کے علم کو پھیلانے والوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ پس جس قدر ان سب لوگوں کے حالات کا معلوم کرنا مشکل تھا اسی قدر قرب زمانہ کے سبب سے اس میں آسانی بھی تھی۔ علاوہ ازیں ہر زمانہ کے محدثین نے بجائے خود احادیث کو پوری تنقید اور تحقیق کے بعد قبول کیا اور پھر اپنے شاگردوں کو حدیث سکھانے کے علاوہ یہ تنقیدی علوم بھی سکھائے۔ پس حدیث کے ساتھ ساتھ ہی ہر مرحلہ پر تنقیدی علوم متعلقہ حدیث بھی جمع ہوتے چلے گئے۔ اور میں یہ پہلے لکھ چکا ہوں کہ تابعین کے زمانہ میں بھی علم جرح وتعدیل کے امام پائے جاتے تھے۔ جنہوں نے اس علم کے متعلق واقعات کو تحقیق اور جمع کیا۔ پس اگرچہ ان محدثین کی راہ میں جنہوں نے تیسری صدی ہجری کے شروع میں حدیث کو کتابوں میں لکھنا شروع کیا، بہت سی مشکلات تھیں۔ مگر یہ مشکلات ایسی نہ تھیں جن کا حل کرنا محالات سے ہوتا۔ بلکہ ان کے حل کرنے کے سامان بھی ساتھ ہی موجود تھے۔

محدثین نے ایک دوسرے سے آزادرہ کرتنقید کی:

ایک اور اعتراض جو میور نے کیا ہے یہ ہے کہ محدثین کو ایک دوسرے کی تحقیق پر کوئی اعتبار نہ تھا۔ کیونکہ ہر ایک محدث نے اپنے اپنے طریق سے تخریج احادیث کی ہے۔ گویا اپنے سے پہلے محدث کی تحقیق کو اس نے درست نہیں سمجھا۔ عیب نمایدہنرش در نظر والا معاملہ ہے، ان لوگوں نے اسلام پر اعتراض کرنے کا ٹھیکہ لیا ہوا ہے اور نہیں سوچتے کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ جہاں تک ہم دیکھتے ہیں ہر محدث کی آزادانہ تحقیقات صحت احادیث پر ایک کھلا کھلا گواہ ہے۔ مگر پادری صاحبان کے نزدیک یہی اعتراض ہے۔ اگر محدثین آزادانہ تحقیقات الگ الگ نہ کرتے تو پھر یہی لوگ کہتے کہ ایک شخص نے جو حدیثیں جمع کر دیں سب نے اسی کا تتبع کیا۔ اس لیے یہ احادیث قابل اعتبار ہی نہیں۔ کیونکہ صرف ایک شخص کی رائے کی پیروی سب نے کی ہے۔ اور اس سے پادری صاحبان کو یہ کہنے کا موقع بھی ملتا کہ اسلام میں آزادانہ تحقیقات کی روح ہی نہیں ہے۔ لیکن جب ایسی تحقیق کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ الگ الگ راہوں پر چل کر کل محدثین ایک ہی نتیجہ پر پہنچے۔ تو اب پادری صاحبان کہتے ہیں کہ محدثین کو ایک دوسرے کی صداقت کا اعتبار نہ تھا۔ میں کہتا ہوں کہ محدثین کے اس طریق سے ہمیں صحت حدیث پر بڑی بھاری دلیل ملتی ہے۔ کیونکہ جو کچھ اختلاف باہمی اعلیٰ طبقہ کے محدثین میں ہیں وہ بمقابلہ متفقہ احادیث کے کچھ بھی نہیں۔ پس اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ واقعی یہ احادیث کے مجموعے قابل اعتبار ہیں۔ اور کم از کم یہ کہ جن احادیث پر دو دو تین تین چار

چار محدثین کا اتفاق ہوگیا ان کی صحت میں عموماً کوئی شک نہیں ہوسکتا۔ مختلف زمانوں میں، مختلف ممالک میں، مختلف آدمیوں کا اپنے اپنے طور پر تحقیقات کر کے سب کا ایک ہی بات پر متفق ہوجانا اس بات کی صحت پر ایک بڑی بھاری شہادت ہے۔ مثلاً جو کتابیں دوسری صدی ہجری کے نصف میں لکھی گئیں اور جو تیسری صدی ہجری میں لکھی گئیں وہ بھی ایک دوسرے کی تائید ہی کرتی ہیں۔ اور سوائے اس کے کہ پچھلی کتابیں جامع ہیں اور کوئی اختلاف ایسا نظر نہیں آتا جس سے احادیث کے قابل اعتبار ہونے پر کوئی شبہ پڑ سکے۔ بلکہ تمام بڑی بڑی باتوں اور اہم امور میں ان سب کا اتفاق ہے۔

حدیث میں اختلافات:

اب جب ہم اختلافات پر غور کرتے ہیں تو ان میں کوئی ایسی بات نہیں پاتے جس سے حدیث کی صحت پر شبہ وارد ہوسکے۔ بلکہ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایسے اختلاف ہوتے اور ان اختلافوں کا ہونا دراصل احادیث کی صحت پر ہی شہادت ہے۔ مثلاً اول تو فروع میں مذہب اسلام نے ایسی سختی نہیں کی اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے درمیان بھی اختلافات فروع میں پائے جاتے ہیں۔ جس کی وجہ صرف یہی ہوسکتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض فعلوں کو کئی طرح کر کے دکھایا یا بعض امور میں خود ہی رخصت دی۔ اس کی شہادت کثرت سے احادیث میں ملتی ہے۔ بلکہ جب امام مالک رحمۃ اللہ علیہ مؤطا لکھ چکے تو خلیفہ ہارون الرشید نے آپ سے یہ مشورہ کیا کہ مؤطا کو کعبہ میں لٹکا دیا جائے اور لوگوں کو یہ حکم دیا جائے کہ وہ سب اسی پر عمل کریں جو مؤطا میں لکھا گیا ہے۔ تو امام مالک نے فرمایا کہ

ایسا نہیں کرنا چاہئے کیونکہ فروع میں تو صحابہ میں بھی اختلاف تھا اور وہ دور دور ملکوں میں پھیل چکے تھے۔ جس سے یہ معلوم ہوا کہ بعض اختلاف جائز ہیں اور ان اختلافوں کے ہونے سے کسی حدیث کی صحت پر شک نہیں پڑ سکتا۔ ایسا ہی جب خلیفہ منصور نے امام مالک سے کہا کہ مؤطا کے نسخے سب شہروں میں بھیج دیئے جائیں اور کل لوگوں کو تاکید کی جائے کہ وہ اس پر عمل کریں۔ تو یہی جواب اس وقت بھی انہوں نے دیا۔ دوسری قسم کے فرق وہ ہیں جو اس وجہ سے اختلاف معلوم ہوتے ہیں کہ یا تو مثلاً دو تصنیفوں کا دائرہ ایک سا ہی وسیع نہیں۔ مثال کے طور پر مؤطا اور صحیح بخاری کو لو۔ صحت کے لحاظ سے یہ دونوں سب سے اعلیٰ طبقہ حدیث کی کتابیں ہیں مگر مؤطا میں صرف تین سو کے قریب حدیثیں ہیں۔ اور صحیح بخاری میں اڑھائی ہزار سے کچھ اوپر ہیں۔ اب اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ امام مالک نے صرف اہل حجاز کی حدیثیں لیں۔ لیکن امام بخاری نے بلاد و امصار میں پھر کر ہر جگہ سے حدیثیں جمع کیں۔ اور اسی طرح امام مالک نے ہر قسم کی حدیثیں جمع نہیں کیں۔ اور امام بخاری نے ہر قسم کی حدیثیں جمع کیں۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم اور ابوداؤد کی حدیثوں میں بھی ایک قسم کا فرق پایا جاتا ہے۔ جس کی وجہ وہ قوانین تنقید ہیں جو ہر ایک نے الگ الگ اختیار کئے۔ مثلاً مسلم کے نزدیک یہ کافی ہے کہ جو راوی حدیث بیان کرتا ہے اس کے متعلق یہ ثابت ہو کہ جس سے وہ حدیث بیان کرتا ہے یعنی اس کا شیخ وہ اس کا ہمعصر ہے۔ مگر بخاری کے نزدیک اس قدر پر اکتفا کرنا ٹھیک نہ تھا۔ بلکہ انہوں نے جس قانون تنقید کی رو سے حدیثوں کو قبول کیا ہے وہ یہ ہے کہ راوی کا اپنے شیخ سے ملاقات کرنا ثابت ہو۔ اس طرح پر بخاری کے قوانین تنقید دوسرے تمام محدثین

کی نسبت سخت تر تھے اور ان کی پابندی سے حدیث کو جمع کرنا بہت ہی مشکل کام تھا۔ مگر چونکہ جس طریق پر امام بخاری حدیثوں کو پرکھتے تھے وہ بہت محتاط طریق تھا۔ اس لیے بخاری کی حدیثیں بھی صحت کی رو سے افضل ہیں۔ اگرچہ تعداد میں کم ہیں۔ اور جو عام اعتقاد امت محمدیہ کا اس کتاب کے متعلق ہے کہ یہ [اَصَحُّ الْکُتُبِ بَعْدَ کِتَابُ اللّٰہِ] ہے وہ بالکل درست ہے۔ ایسا ہی صحیح مسلم، ابوداؤد اور ترمذی، نسائی وغیرہ سے فضیلت رکھتی ہے۔ کیونکہ جہاں بخاری اور مسلم صرف ان احادیث کی تخریج کرتے ہیں جن کے راویوں کے قابل اعتبار ہونے پر پہلے محدثین کا اتفاق رہا ہو۔ نسائی نے ان حدیثوں کو بھی لے لیا ہے جن کے راویوں کے قابل اعتبار ہونے میں اگرچہ اتفاق نہیں مگر ان کے نا قابل اعتبار ہونے پر بھی اتفاق نہیں۔ یعنی کسی نے ان راویوں کو ثقہ مانا ہے اور کسی نے غیر ثقہ۔ ایسا ہی ابوداؤد نے ان ابواب میں جہاں انہیں اعلیٰ طبقہ کی صحیح احادیث نہیں ملیں ضعیف حدیثوں کو لے لیا ہے۔ پس ان مختلف قواعد تنقید کی پیروی سے یہ ضروری تھا کہ بعض حدیثیں جو ایک محدث نے قبول کر لی ہیں دوسرا انہیں قبول نہ کرتا۔ اب ان اختلافات کو چھوڑ کر جن کا ذکر اوپر ہوا یعنی وہ اختلافات جو فروعی مسائل میں پائے جاتے ہیں اور جن کا ہونا صحابہ میں بھی ثابت ہے یا وہ فرق جو بسبب تنگی یا وسعت دائرہ تحقیق کے پیدا ہوئے اور وہ فرق جو بسبب قواعد تنقید میں سختی یا نرمی کے پیدا ہوئے۔ ان اختلافات کو جو کہ دراصل حدیث کی صحت پر ان سے کوئی شبہ وارد نہیں ہوتا، الگ رکھ کر باقی جو اختلاف رہ جاتے ہیں وہ برائے نام اختلاف ہیں۔ اور اس طرح پر مختلف محدثین کی اپنی اپنی آزادانہ تحقیقات کا نتیجہ احادیث کا ایک عظیم الشان مجموعہ ہے

جس کی صحت میں ایک محقق کو کسی قسم کا شک نہیں ہوسکتا۔

محدثین کا شاہانِ وقت کے اثر کے ماتحت نہ ہونا:

ایک اور اعتراض تنقید حدیث کے متعلق جو پادری صاحبان کرتے ہیں یہ ہے کہ محدثین نے طرح طرح کے اثروں سے متاثر ہوکر احادیث کو جمع کیا ہے۔ سب سے بڑھ کر ان بادشاہوں کے اثر سے جن کی حکومت میں جمع حدیث کا کام ہوا۔ میں اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ کسی خوشامدی نے کسی بادشاہ کے خوش کرنے کے لیے حدیثیں وضع کی ہوں۔ مگر یہ کہنا کہ بخاری اور مسلم جیسے محدثین نے احادیث کو جمع کرتے وقت بادشاہ وقت کا لحاظ کیا اور مضبوط اور صحیح احادیث کو جو بادشاہ کے فوائد کے منافی تھیں ردّ کر دیا۔ یا کمزور احادیث جن سے اس کے فوائد کی تائید ہوتی تھی قبول کرلیا، ان راستباز محققین پر سراسر افترا ہے۔ جن محققین نے احادیث کو جمع کیا ان کو قطعاً حکومت کی کوئی پرواہ نہ تھی اور نہ حکومت کے اثر کے نیچے تھے۔ نہ وہ بادشاہوں کے درباروں میں جانے والے تھے اور نہ ان کو یہ خیال تھا کہ ہمارے کسی منصب یا عزت میں فرق آ جائے گا۔ وہ صرف اسی عزت کے خواہاں تھے جو خدا کے ہاں سے سچے متقی کو ملتی ہے۔ جب بخارا کے حاکم نے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے یہ درخواست کی کہ اس کے لڑکوں کو شاہی محل میں آ کر پڑھایا کریں تو انہوں نے جواب دیا کہ میں علم فروشی نہیں کرتا۔ پھر جب اس نے کہا کہ آپ اپنے مکان پر ہی پڑھائیں لیکن دوسرے لوگوں سے الگ کر کے پڑھائیں تو یہ بھی نامنظور کیا اور فرمایا کہ اگر آپ ان کو پڑھانا چاہتے ہیں تو جہاں عام لوگ بیٹھتے ہیں وہیں

یہ بھی آ جایا کریں۔ چنانچہ جلاوطنی قبول کی مگر اس بات کو قبول نہ کیا کہ علم کو شاہی اثر کے نیچے آنے دیں یا بادشاہی کو علم کے مقابلہ پر کوئی عزت دیں۔ ایسا ہی اور بھی مثالیں موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ محدثین کو بادشاہوں کی ہرگز پرواہ نہ تھی اور حدیث کے جمع کرنے میں وہ صرف انہی قواعد تنقید کے پابند تھے جن کو انہوں نے ضروری سمجھا۔ بلکہ ایک مشہور شاہی قاضی کے متعلق جب انہیں معلوم ہوا کہ اس نے بادشاہ کے خوش کرنے کے لیے ایک حدیث میں ایک لفظ بڑھا دیا ہے تو اس کی حدیث کو انہوں نے مطلقاً چھوڑ دیا۔

غلطی کا امکان:

باوجودیکہ میور محدثین کے اصول تنقید کو بالکل بے حقیقت ظاہر کرتا ہے مگر ساتھ ہی وہ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ وہ اس قدر سخت تھے کہ ایک سو میں سے ننانوے حدیثوں کو انہی قواعد کی رو سے وہ قبول نہیں کر سکے۔ اب میں یہ پوچھتا ہوں کہ اگر ان اصول کی رو سے جن پر پادری صاحبان کے نزدیک اصول تنقید کا نام چسپاں نہیں ہوسکتا۔ صرف سو میں سے ایک حدیث قبول کی گئی ہے۔ تو پھر ان کے فرضی اصول تنقید کی رو سے تو لاکھ میں سے ایک حدیث بھی قابل اعتبار نہیں ہونی چاہئے۔ دوسری طرف یہ تعجب آتا ہے کہ ان کے یہ خیالی قواعد تنقید جن کے بغیر یورپین دل اور دماغ خوش نہیں ہوسکتا اس وقت کہاں رکھے جاتے ہیں جب اناجیل کے بے سروپا قصوں کو وہ صحیح تاریخ سے بھی بڑھ کر کچھ رتبہ دیتے ہیں۔ حالانکہ ایشیائی قواعد تنقید سے پرکھا جانے پر بھی وہ

اس طرح پاش پاش ہوجاتے ہیں جس طرح نور کے سامنے ظلمت۔ مگر احادیث کے متعلق میور کو خود اقرار ہے کہ ''دوسری صدی ہجری میں حدیث میں اکثر حصہ صداقت کا پایا جاتا ہے۔'' تو پھر اگر وہ اکثر حصہ صداقت کا محدثین کی جمع کردہ احادیث میں نہیں تو کیا ان احادیث میں ہے جن کو محدثین نے نا قابل اعتبار سمجھ کر رد کر دیا ہے؟ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مخالف خواہ کیسا ہی مخالفت پر تلا ہوا ہو اس قدر حماقت کا دعویٰ کرے گا۔ محدثین نے تاریخی طور پر احادیث کی صداقت کو ثابت کیا ہے۔ ان سے غلطی کا ہوجانا بھی ممکن ہے۔ مگر اتنی بات سے وہ تاریخ کی حیثیت سے گر نہیں سکتیں۔ کیونکہ کسی تاریخ کے متعلق خواہ وہ ان واقعات کے زمانے میں ہی لکھ لی گئی ہو جب ان کا ظہور ہو۔ مگر تاہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ غلطی کی آمیزش سے بالکل پاک ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک حدیث جسے کئی محدثین نے نا قابل اعتبار سمجھ کر رد کر دیا ہو دراصل صحیح ہو مگر اس کی صحت کا ثبوت اور طرح سے ملنا چاہئے۔ ایسے امکانوں کی بنا پر کوئی سمجھدار آدمی یہ طریق اختیار نہیں کیا کرتا کہ ہر ایک معتبر اور مستند واقعہ کو فرضی سمجھ لے اور جھوٹے مضمون کو صحیح سمجھ لے۔ بلکہ جہاں اس قدر تحقیق سے ایک کام کیا گیا ہے اس میں اگر کوئی غلطی ہے تو اس کے لیے دلائل پیش کرنے چاہئیں۔ اور اگر کوئی صحیح امر اس سے باہر چھوڑ دیا گیا ہے تو اس کی صحت کا ثبوت دینا چاہئے۔ محدثین نے ہر طرح سے اور پوری پوری نیک نیتی سے اپنی تحقیقات کی ہیں اور جن نتائج پر وہ پہنچے ہیں ان کو آج ہم یہ بات کہہ کر رد نہیں کر سکتے کہ ممکن ہے انہوں نے کوئی غلطی کی ہو۔

بخاری کی فضیلت:

تمام حدیث کے مجموعوں میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب فوقیت رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ کل امت محمدیہ کا اس پر اتفاق ہوگیا ہے کہ وہ [اَصَحُّ الْکُتُبِ بَعْدَ کِتَابُ اللّٰہِ] ہے۔ زمانہ کے لحاظ سے بھی یہ کتاب جمع حدیث کی تکمیل کو پہنچانے میں سب پر مقدم ہے اور اپنی خوبیوں کے لحاظ سے بھی سب پر فضیلت رکھتی ہے۔ اس کو یہ عزت اور شہرت بعد کے زمانے میں ہی حاصل نہیں ہوئی بلکہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے تمام ہمعصر ان کی اس تصنیف کی فضیلت کے سامنے سر جھکاتے تھے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ انہوں نے احادیث کے لینے میں بہت ہی احتیاط کی تھی۔ مثلاً صحت حدیث کے لیے عام شرط تو صرف اسی قدر تھی کہ راوی مسلم ہو، صادق ہو، مدلس (یعنی ایک روایت کو دھوکہ دے کر دوسرے کی بیان کرنے والا) نہ ہو، مختلط نہ ہو، صفات عدالت سے متصف ہو، ضابط اور متحفظ ہو، سلیم الذہن ہو، قلیل الوہم ہو، سلیم الاعتقاد ہو۔ لیکن ان سب احتیاطوں کے علاوہ امام بخاری اور بھی کئی طرح کی احتیاطوں سے کام لیتے تھے۔ اگر ایک محدث مثلاً زہری کے شاگردوں کو پانچ طبقوں پر تقسیم کیا جائے تو وہ عموماً صرف سب سے اعلیٰ طبقہ کی روایت کو لیتے۔ یعنی وہ طبقہ شاگردوں کا جس کے متعلق یہ ثابت ہو کہ یہ زہری کی صحبت میں اکثر رہے ہیں۔ اور سفر و حضر میں انہوں نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ جیسے یونس بن یزید، عقیل بن خالد، مالک بن انس، سفیان بن عیینہ، شعیب بن ابی حمزہ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایسے راویوں میں غلطیوں کا احتمال بہت کم رہ جاتا تھا۔ کیونکہ اکثر ساتھ رہنے سے

بار بار احادیث کو وہ سنتے تھے۔ اب اگر چہ زہری کے راویوں کا دوسرا طبقہ بھی بلحاظ حفظ و اتقان وغیرہ کے قابل اعتماد ہے لیکن یہ خصوصیت جو طبقہ اول کو حاصل تھی دوسرے طبقہ کو حاصل نہ تھی۔ اس لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے طبقہ اول کی ہی روایت لی ہے جو سب سے معتبر طبقہ تھا۔ ایسا ہی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے دوسرے محدثین کی طرح صرف اس قدر ثبوت پر اکتفا نہیں کیا کہ راوی اپنے شیخ کا ہمعصر ہو۔ بلکہ جب تک راوی کی اپنے شیخ سے ملاقات کا ثبوت نہ ملے اس وقت تک وہ اس کی حدیث کو قبول نہ کرتے تھے۔

امام بخاری کے اصول تنقید کی سختی:

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے قواعد تنقید اس قدر سخت تھے کہ وہ خود کہتے ہیں کہ میں نے ایک شخص کی دس ہزار حدیثوں کو چھوڑ دیا کیونکہ مجھے اس کی صداقت پر شبہ ہو گیا تھا۔ اگر چہ پادری صاحبان مسلمان محدثین کے اصول تنقید پر اپنا اطمینان ظاہر نہیں کرتے مگر یہ یقینی امر ہے کہ اگر کبھی بخاری جیسا ایک انسان عیسائی مذہب میں پیدا ہوتا تو پولوس جیسے آدمی کی شہادت کو وہ ہرگز قبول نہ کرتا۔

عیسائی بزرگوں کا دین کی خاطر جھوٹ بولنے کو جائز رکھنا:

کیونکہ پولوس وہ شخص ہے جس نے صریح طور پر عیسائی مذہب کے پھیلانے کے لیے جھوٹ کا بولنا جائز رکھا۔ جیسا کہ وہ رومیوں باب :3 آیت :7 میں لکھتا ہے:

''پھر اگر میرے جھوٹ کے سبب خدا کی سچائی اس کے جلال کے لیے زیادہ ظاہر ہوئی تو مجھ پر کیوں گنہگار کی طرح حکم ہوتا ہے''۔

میں سچ کہتا ہوں کہ اگر عیسائیوں کے درمیان ایک انسان بھی ایسا منقد اور محتاط نہیں تو ایسا دیانتدار ہی ہوتا، جیسا اسلام کے یہ عظیم الشان محدثین تھے۔ تو حضرت مسیح کا مذہب کچھ نہ کچھ ضرور اپنی اصلیت پر رہ جاتا۔ مگر افسوس کہ ان لوگوں نے مسیح کو خدا بنانے کے لیے طرح طرح کے جھوٹ سے کام لیا اور ان کے بڑے بڑے اسقف یہ اصل اپنے مدنظر رکھتے تھے جس کو یوسیبٹس ان الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ

''میں نے وہ تمام باتیں بیان کر دی ہیں جن سے ہمارے مذہب کا ظاہر ہو اور ان تمام باتوں کو دبا دیا ہے جن سے ہمارے مذہب پر کسی طرح سے زد پڑتی تھی۔''

پس ایسے ایسے حامیان دین کے ہوتے ہوئے جو کھلے طور پر اپنے اصول کو ان الفاظ میں بیان کرتے تھے۔ ہم یقین کر سکتے ہیں کہ عیسائی مذہب کی جو تحریریں ہمارے ہاتھ میں ہیں ان میں بہ نسبت راستی کے جھوٹ زیادہ ہے۔ مسلمانوں میں بھی ایسے آدمی ہوئے ہیں جنہوں نے جھوٹی احادیث بنا کر مشہور کیں۔ مگر مسلمان علماء اور محدثین نے ان کے جھوٹ کو دین میں ملنے نہیں دیا اور ان جھوٹوں سے جن کے بنانے والے اکثر یا تو خودغرض تھے یا زندیق لوگ جو مذہب اسلام کو ان جھوٹوں سے نیست و نابود کرنا چاہتے تھے۔ اہل اسلام نے اس وقت سے لے کر آج تک ہمیشہ بیزاری ظاہر کی ہے اور ان

کے ناپاک جھوٹوں سے لوگوں کو بچانے کے لیے فی الفور کتابیں تصنیف کیں۔ مگر مذہب کی ترقی کی خاطر جھوٹ بولنا جس کا پولوس اور اس کے بڑے بڑے جانشین اسقف فخریہ اقرار کرتے ہیں، اسلام ایسی ناپاکی سے ہمیشہ پاک رہا ہے۔ کیونکہ اس کے بانی ﷺ نے پہلے سے ہی اپنی امت کو متنبہ کر دیا تھا کہ جو شخص میرے نام سے جھوٹ بنائے گا اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ پس اسلام میں مذہب کی خاطر جھوٹ بنانا ایک سخت ناپاک جرم تھا مگر عیسائیت نے اس پر فخر کیا ہے۔ پھر جن لوگوں کے گھر میں یہ حالت ہو ان کو اسلام کے محقق محدثین پر اعتراض کرتے ہوئے شرم کرنی چاہئے۔

امام بخاری کے ننانوے حدیثوں میں سے ایک کو لینے کے معنی:

یہاں میں اس بات کا جواب دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جو چھ لاکھ حدیثوں میں سے صرف چند ہزار یعنی قریباً سات ہزار کو لیا اور اس طرح گویا سو حدیث میں سے ایک کو لیا اور ننانوے کو ترک کر دیا تو اس کے کیا معنی ہیں؟ کیا فی الواقع اس وقت موضوع احادیث کی اس قدر کثرت تھی کہ آپ کو سو میں سے ننانوے ترک کرنی پڑیں؟ اور ان ننانوے کو انہوں نے موضوع سمجھ کر ترک کیا۔ اور آیا فی الواقع وہ سب کی سب نابود ہو گئیں؟ اس سے تو یہ وہم پیدا ہو گا کہ واقعی محدثین کے زمانہ میں احادیث میں جھوٹ اس قدر مل گیا تھا کہ سو میں سے گویا ننانوے حصے جھوٹ تھا۔ یہ وہم بالکل فضول ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں حدیث کے مرکز بہت تھے۔ جہاں علیحدہ علیحدہ حدیث کا درس ہوتا تھا اور سینکڑوں کی تعداد میں حدیث کو ایک دوسرے سے

روایت کرنے والے تھے۔ پس جب چھ لاکھ حدیث کہا جاتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ فی الواقع اس قدر الگ الگ حدیثیں تھیں۔ ایک ہی حدیث کو جب ایک سلسلہ روایت سے بیان کیا جائے اور پھر اس کے سلسلہ رواۃ میں ایک آدمی کی بجائے دوسرا داخل ہوجائے تو یہ ایک علیحدہ حدیث سمجھی جاتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب علم حدیث کا چرچا اس قدر تھا تو راویوں کے اختلاف کے لحاظ سے احادیث کی تعداد کا لاکھوں تک پہنچ جانا ایک معمولی امر تھا۔ لاکھوں حدیثوں کے ہونے سے صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ کس قدر مختلف راوی اس وقت حدیثوں کے روایت کرنے والے تھے۔ اب ان میں سے بہتیرے لوگ گمنام ہوں گے جن کے حالات کا پورا علم نہیں چلا۔ پس ایسی احادیث یعنی روایت مختلفہ کو محدثین نے ترک کر دیا۔ اسی اصول کے مطابق اب بھی صحیح بخاری میں جو احادیث مکرر آئی ہیں مگر ان کے سلسلہ روایت میں کہیں تبدیلی ہوگئی ہے۔ تو اس کو ایک الگ حدیث گنا جاتا ہے اور اسی وجہ سے صحیح بخاری کی احادیث کی تعداد سات ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے۔ ورنہ مکررات کو حذف کرنے سے یہ تعداد اڑھائی ہزار کے قریب رہ جاتی ہے۔

صحاح ستہ کے سوا دیگر کتب احادیث میں تنقید میں تساہل:

صحاح ستہ کے بعد دوسری کتب حدیث کا مرتبہ ہے۔ ان کے جمع کرنے میں اس قدر قواعد تنقید کی سختی نہیں برتی گئی جیسے کہ صحاح میں۔ اس لیے ان کتابوں میں ہر قسم کی احادیث شامل ہیں۔ البتہ یہاں بھی یہ احتیاط ضرور پائی جاتی ہے کہ جن احادیث میں

مسائل دین بیان ہوئے ہیں ان کی صحت کے پرکھنے میں زیادہ سختی سے کام لیا گیا ہے اور جن احادیث میں قصص یا دیگر اخبارات یا اور امور ہیں ان میں زیادہ تر تساہل سے کام لیا گیا ہے کیونکہ اس کا کوئی چنداں اثر دین پر نہیں پڑتا۔ چنانچہ بیہقی نے کسی دوسرے کا قول نقل کرتے ہوئے کتاب المدخل میں لکھا ہے:

"إِذَا رَوَيْنَا فِي الْفَضَآئِلِ فِي الْحَلَالِ وَالْحَرَامِ وَالْأَحْكَامِ شَدَّدْنَا فِي الْأَسَانِيْدِ وَانْتَقَدْنَا فِي الرِّجَالِ وَإِذَا رَوَيْنَا فِي الْفَضَآئِلِ وَالثَّوَابِ وَالْعِقَابِ سَهَّلْنَا فِي الْأَسَانِيْدِ وَتَسَامَحْنَا فِي الرِّجَالِ".

یعنی ''جب ہم آنحضرت ﷺ سے حلال وحرام اور احکام کے بارہ میں روایت لیتے ہیں تو سند میں سختی سے کام لیتے ہیں اور راویوں کو خوب پرکھ لیتے ہیں اور جب فضائل میں اور ثواب وعقاب کے متعلق روایت کرتے ہیں تو ہم سند میں نرمی سے کام لیتے ہیں اور راویوں کے متعلق چشم پوشی کرتے ہیں۔''

ایسا ہی امام احمد بن حنبل، ابن سحاق کے متعلق لکھتے ہیں:

"اِبْنُ إِسْحَاقٍ رَجُلٌ تُكْتَبُ عَنْهُ هٰذِهِ الْأَحَادِيْثُ -يَعْنِي الْمَغَازِي وَنَحْوِهَا- وَإِذَا جَآءَ الْحَلَالُ وَالْحَرَامُ أَرَدْنَا قَوْمًا هٰكَذَا." وَقَبَضَ أَصَابِعَ يَدِهِ الْأَرْبَعِ.

یعنی ''ابن اسحاق اس پایہ کے آدمی ہیں کہ یہ (یعنی مغازی وغیرہ کی حدیثیں) ان سے روایت کی جاسکتی ہیں۔ اور جب حلال اور حرام کے مسائل آئیں تو پھر ہم کو ایسے لوگ درکار ہیں۔'' اور یہ کہہ کر انہوں نے چاروں انگلیاں بند کر کے دبالیں۔ (ماخوذ از سیرت النبی مصنفہ شبلی)

کیا ہم روایت یا درایت کی رو سے تنقید حدیث نہیں کر سکتے؟

اس بحث سے یہ بھی ظاہر ہے کہ محدثین نے نہ صرف کامل طور پر تنقید روایت ہی کی ہے بلکہ درایت کی رو سے بھی ایک حد تک تنقید کی ہے۔ گو ان اصول کو جو انہوں نے احادیث موضوع کے پرکھنے کے لیے تجویز کئے بنظر احتیاط زیادہ وسعت نہ دی ہو۔ لیکن ہمارے سامنے اب ایک نہایت ضروری سوال آتا ہے کہ آیا محدثین رحمۃ اللہ علیہ کی کوششوں نے ہم کو بالکل تنقید احادیث سے مستغنی کر دیا ہے؟ یہ دعویٰ ان بزرگوں کا نہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ سلسلہ روایت کے ساتھ ہی حدیث کو بیان کرتے ہیں تاکہ آئندہ بھی کوئی اس پر تنقید کر سکے۔ اور جس طرح باوجود محدثین کی ان تھک کوششوں اور کمال سعی کے سلسلہ روایت پر ہم اب بھی تنقید کر سکتے ہیں، اسی طرح درایت کی رو سے بھی ہم کسی حدیث کو زیر بحث لا سکتے ہیں۔ اصول درایت جن کو میں نے اوپر شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ صاحب کے نافعہ عجالہ سے نقل کیا ہے، دراصل محدثین کے قائم کردہ ہی ہیں۔ ابن جوزی نے بھی قریب قریب یہی اصول بیان کئے ہیں اور ان تمام احادیث کو موضوع کہا ہے جو عقل یا اصول مسلمہ یا محسوسات اور مشاہدہ کے خلاف ہوں۔

حدیث موضوع کا پتہ کس طرح لگ سکتا ہے؟

ملا علی قاری نے موضوعات میں بھی اسی کے قریب اصول درایت بیان کیے ہیں اور لکھا ہے کہ ابن قیم الجوزیہ سے سوال کیا گیا کہ حدیث موضوع کا پتہ سوائے سند کو دیکھنے کے بھی لگ سکتا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ ایسا شخص ان کو پہچان سکتا ہے جو سنن صحیحہ سے خوب واقف ہو گویا وہ اس کے گوشت پوست میں داخل ہو چکی ہوں اور معرفت سنن میں اسے خصوصیت حاصل ہو چکی ہو اور نبی کریم ﷺ کی سیرت اور آپ کے اخلاق سے وہ پورا واقف ہو اور جانتا ہو کہ آپ کیا حکم دیتے ہیں اور کس بات سے روکتے ہیں؟ اور آنحضرت ﷺ کے حالات سے اسے ایسا شدید تعلق ہو چکا ہو کہ گویا اسے صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرح آپ سے مخالطت حاصل ہو چکی ہے۔ تو ایسا شخص آپ کے احوال اور اوامر و نواہی کو خوب پہچان سکتا ہے اور اس کے بعد ان امور کلی کو بیان کیا ہے جن سے حدیث موضوع پہچانی جا سکتی ہے۔ جن میں سے بعض وہی ہیں جو اوپر بیان ہوئے۔ مگر چند خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ مثلاً کہ حدیث سنن صریحہ کے خلاف ہو۔ جیسے مثلاً یہ حدیث کہ جس کا نام محمد یا احمد ہو وہ آگ میں داخل نہیں ہوگا کیونکہ آگ سے نجات اعمال پر ہے نہ ناموں پر یا القاب پر۔ یہ اصول دینی کے خلاف ہے۔

تنقید حدیث کے پانچ موٹے اصول:

پس یہ ایک نہایت محکم اصول ہے جو ہمارے ہاتھ میں ہے کہ جو حدیث اصول

دینی کے خلاف ہو وہ قبول نہیں کی جائے گی۔ ایسا ہی ایک اصول کلی یہ بیان کیا ہے کہ وہ حدیث جو واقعات یا مشاہدہ کے خلاف ہو یعنی فی نفسہٖ باطل ہو۔ تیسرا قصوں کی احادیث ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"اَلْأَحَادِيْثُ الَّتِيْ يُذْكَرُ فِيْهَا الْخَضِرُ وَحَيَاتُهُ كُلُّهَا كَذِبٌ وَّلَا يَصِحُّ فِي حَيَاتِهِ حَدِيْثٌ وَاحِدٌ.

یعنی ''وہ حدیثیں جن میں خضر اور اس کی زندگی کا ذکر ہے سب کی سب جھوٹی ہیں اور اس کی زندگی کے متعلق ایک بھی حدیث صحیح نہیں۔''

ایسا ہی عوج بن عنق کے قد کی حدیثیں یہ کہ وہ 3333 گز لمبا تھا یا یہ کہ سمندر میں چلتا ہوا سمندر کی تہہ سے مچھلی نکال کر سورج کے سامنے رکھ کر بھون کر کھاتا تھا۔ اس قسم کی بہت سی خرافات قصوں میں قصہ گو لوگوں نے داخل کر دی ہیں۔ اسی لیے بعض لوگوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ تفسیر کی کتابوں کا کوئی اصول نہیں۔ جیسا کہ مغازی اور ملاحم کا کوئی اصول نہیں۔ کیونکہ سب قسم کے قصے جو مل گئے وہ بغیر تنقید کے لے کر ان میں داخل کر دیئے گئے ہیں۔ چوتھا اصول یہ ہے کہ جو حدیث قرآن شریف کے صریح مخالف ہو۔ جیسے مثلاً وہ احادیث جن میں رسول اللہ ﷺ کی طرف علم غیب منسوب کیا گیا ہے۔ کیونکہ قرآن شریف صاف فرماتا ہے: ﴿قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ﴾ [الانعام:50:6] پانچواں اصول یہ ہے کہ قرائن سے حدیث کا غلط ہونا معلوم ہو۔

روایت میں وہ حصہ جس میں قیاس کو دخل دیا گیا ہے:

علاوہ ان تمام امور کے میں ایک خاص امر کے ذکر کی ضرورت سمجھتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ حدیث میں اس بات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ اس میں کچھ اقوال یا افعال یا مشاہدات ہوتے ہیں اور کچھ حصہ بعض وقت راوی کے قیاس کا داخل ہوجاتا ہے۔ جس حصہ کی بنیاد قیاس پر ہے اس کو وہی وقعت دینی چاہئے جو ایک صحابی یا دوسرے راوی کے قیاس کو دی جاسکتی ہے۔ بعض صحابہ اپنے اجتہاد میں کمال کو پہنچے ہوئے ہیں۔ بعض اس سے کم مرتبہ پر ہیں۔ سب کا اجتہاد یا قیاس یکساں طور پر قابل قبول نہیں اور بعض وقت جو نتیجہ راوی نے کسی واقعہ سے نکالا ہوتا ہے وہ بالکل قابل قبول نہیں ہوتا۔ مثلاً بعض وقت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایات میں اصل بات کا ذکر کرکے آجاتا ہے: فَاقْرَءُوْا إِنْ شِئْتُمْ تو یہ ان کا اپنا قیاس ہوتا ہے۔ ایسا ہی اور جگہ بھی قیاس روایات میں داخل ہوگیا ہے۔ یہ فی الحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

علمائے حنفی کا قول ہے کہ اگر راوی فقیہ نہ ہو جیسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہ ان کا گو حفظ حدیث میں بڑا مرتبہ ہے مگر فقاہت میں وہ مرتبہ نہیں۔ تو ایسی صورت میں بالمقابل قیاس سے کام لیا جاسکتا ہے۔ یا مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک ماہ کے لیے اپنی بیویوں سے علیحدگی کا معاملہ۔ بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی اس علیحدگی کو بعض لوگوں نے طلاق سمجھ کر اسی رنگ میں معاملہ کو شہرت دے دی۔ یہاں تک کہ عموماً لوگوں نے سمجھ لیا کہ فی الواقع طلاق دے دی ہے؟ حالانکہ امر واقع یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہرگز

طلاق نہیں دی تھی۔ چنانچہ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بالصراحت یہ دریافت کر کے کہ کیا آپ نے ازواج مطہرات کو طلاق دے دی ہے، اس معاملہ کو صاف کر دیا۔ یا مثلاً جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فترت وحی کا ذکر کرتے ہوئے زہری نے یہ حصہ بڑھا دیا ہے کہ وحی کے رک جانے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلند پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ جاتے تھے تاکہ اپنے آپ کو گرا دیں۔ اول تو خود اس واقعہ پر کوئی چشم دید گواہی نہیں۔ کیونکہ اس کی سند صرف زہری تک ہے جو 50 ہجری میں پیدا ہوئے۔ کسی صحابی تک نہیں پہنچائی گئی۔ دوم اس میں بھی اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ امام زہری نے کسی صحابی سے سن کر ہی ایسا لکھا ہوگا تاہم اس حد تک تو مشاہدہ ہوسکتا ہے کہ آپ پہاڑوں پر جاتے ہوں۔ لیکن یہ امر کہ اس غرض کے لیے جاتے تھے کہ اپنے آپ کو گرا دیں۔ محض کسی دیکھنے والے کا قیاس ہوسکتا ہے۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارادہ اور نیت پر کس طرح آگاہ ہوگیا؟ جس امر کا تعلق نیت اور ارادہ سے ہو اس کا مشاہدہ نہیں ہوسکتا۔ علاوہ ازیں یہ قرآن و حدیث کے بھی خلاف ہے۔ مگر اس وقت اس پر تفصیلی بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ اور اگر یہ سوال ہو کہ پھر آپ پہاڑوں پر جاتے کیوں تھے؟ تو میں کہتا ہوں جس غرض کے لیے غار حرا میں جاتے تھے۔ مخلوق خدا کا درد دل میں بھرا ہوا تھا۔ وحی شروع ہو کر رک گئی اس گھبراہٹ میں عاشق کی طرح سرگردان پھرتے تھے۔

تعامل میں آئی ہوئی احادیث اور دوسری احادیث میں فرق:

پس حق یہ ہے کہ گو بخاری اور اس کے بعد باقی صحاح ستہ کی احادیث کا ہم بڑا

مرتبہ یقین کرتے ہیں اور جو کچھ ان لوگوں نے احادیث پر تنقید کرنے میں کوشش کی۔ اب ہم اس کا عشر عشیر بھی نہیں کر سکتے اور نہ ہی ہمارے ہاتھ میں وہ سامان ہیں جن سے ہم ایسا کر سکیں۔ لیکن تاہم حدیث کی تنقید کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ نہ کسی بزرگ نے یہ کہا کہ احادیث کو جس حد تک ہم پرکھ چکے اس سے آگے قدم اٹھانا یا کوئی مزید تحقیق کر کے ان احادیث میں سے جن کو ہم نے صحیح سمجھا ہے کسی حدیث کو غلط قرار دینا گناہ ہے۔ ان بزرگوں نے ظن غالب سے ان احادیث کو صحیح سمجھا اور جن کو رد کیا ان کو بھی ظن غالب سے رد کیا۔ اب اس میں کچھ شک نہیں کہ اس مجموعہ میں بہتیری احادیث ایسی ہیں جن کی صداقت پر تعامل امت نے مہر لگادی ہے اور اکثر مسائل دینی کے متعلق ایسی ہی احادیث ہیں کہ صحابہ نے نبی کریم ﷺ کو ایک کام کرتے دیکھا اور اسی طرح کیا۔ صحابہ کے بعد آنے والی نسل نے اسی طرح وہ کام صحابہ کو کرتے دیکھا اور خود کیا اور اس طرح پر یہ سلسلہ تعامل ہم تک پہنچا۔ جن احادیث پر اس صداقت کی مہر ہے وہ یقین کے مرتبہ تک پہنچی ہوئی ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ بھی احادیث ہیں جن میں فضائل یا قصص یا پیشگوئیاں یا حالات تاریخی وغیرہ امور درج ہیں جو روزانہ زندگی میں ہر شخص کے کام آنے والی چیزیں نہیں۔ ان میں سے جن احادیث کو صحت کے ساتھ تواتر یا شہرت کا مرتبہ حاصل ہے وہ بھی ایک اعلیٰ مرتبہ پر ہیں۔ مگر اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ بہتیری احادیث ایسی ہیں گو وہ صحاح میں ہی پائی جاتی ہیں۔ جن کو ان اصول تنقید کے ماتحت لایا جاسکتا ہے۔ جن کا ذکر خود محدثین نے کیا ہے اور جس طرح بلحاظ روایت وہ احادیث جرح کے ماتحت

آ سکتی ہیں۔اسی طرح بلحاظ درایت بھی جرح کے ماتحت آ سکتی ہے۔

روایت میں غلطی کا احتمال:

یہ بات بلا تامل کہی جاسکتی ہے کہ حدیث کو حفاظت قرآن کریم کا مرتبہ نہیں ملا اور نہ دنیا میں کسی اور کتاب کو ایسی حفاظت نصیب ہوئی۔اعلیٰ پایہ کے محدثین نے بلا شبہ ایسے راویوں کو ترک کرنے کی کوشش کی ہے جو جھوٹ یا نسیان وغیرہ سے متہم ہوئے بایں خود بخاری کی اسنادوں میں بھی کئی ایک ایسے راوی ہیں جن پر جرح ہوئی ہے اور دوسرے محدثین نے تو اس بارہ میں امام بخاری کے برابر سختی سے کام نہیں لیا۔البتہ محدثین کی مجموعی شہادت بڑا وزن رکھتی ہے۔کیونکہ ان سب نے الگ الگ اور اپنے طور پر تحقیق کی۔لیکن علاوہ اس امر کے کہ کوئی راوی متہم ہو یا قوی نہ ہو۔روایت کے سلسلہ میں اور بھی کئی مشکلات ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔اور اسی لیے یہ ضروری ہے کہ تعامل کی احادیث اور احادیث متواتر یا مشہور کو چھوڑ کر باقی احادیث میں بالخصوص ایسی احادیث ہیں جن میں قصص وغیرہ مذکور ہیں، بہت احتیاط سے کام لیا جائے۔خود صحابہ نے بھی دوسرے صحابیوں سے باوجود اس کے کہ وہ ان کو کذب سے متہم نہیں کرتے تھے۔احادیث کے قبول کرنے میں بہت احتیاط سے کام لیا ہے۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث آتی ہے جس میں ذکر ہے کہ میت کو پسماندوں کے رونے کی وجہ سے عذاب کیا جاتا ہے۔تو وہ صاف فرماتی ہیں کہ بلا شبہ انہوں نے جھوٹ نہیں بولا مگر ان سے خطا ہوگئی۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی یہودی کی میت کا ذکر کرتے ہوئے

یوں فرمایا تھا کہ اس کے پسماندگان اس پر رو رہے ہیں حالانکہ اس کو قبر میں عذاب ہو رہا ہے۔ ایسا ہی قلیب بدر والی حدیث کے متعلق ہے۔ (صحیح مسلم کتاب الجنائز)

بخاری میں مذکور ہے کہ جب محمود بن الربیع الانصاری نے عتبان بن مالک سے حدیث بیان کی جس میں آتا ہے: [فَإِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَرَّمَ عَلَى النَّارِ مَنْ قَالَ لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللّٰهُ . يَبْتَغِي بِذَلِكَ وَجْهَ اللّٰهِ] کہ ''اللہ تعالیٰ نے ایسے شخص کو آگ پر حرام کر دیا ہے جو لا الہ الا اللہ کہے اور محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ایسا کرے۔'' تو حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر اس حدیث کے تسلیم کرنے سے انکار کیا اور فرمایا: [وَاللّٰهِ مَا أَظُنُّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَا قُلْتَ قَطُّ.] (صحیح البخاری: 1186) ''خدا کی قسم میں یقین نہیں کرتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی وہ بات فرمائی ہو جو تم کہتے ہو۔'' (یہ ایام جنگ کا واقعہ ہے۔ جب حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ بھی جنگ میں شامل تھے جس میں وہ شہید بھی ہوئے۔ بجائے کہانیاں سنانے کے اور بنانے کے جیسا کہ میور کا خیال ہے۔ یہاں محض قرائن کی بنا پر ایک صحابی ایک حدیث کا انکار کر رہے ہیں۔) اور خود محمود اس بارہ میں متامل ہو گئے۔ کیونکہ انہوں نے یہ عہد کیا کہ میں دوبارہ عتبان بن مالک سے ضرور یہ سوال کروں گا۔ جیسا کہ اسی حدیث میں مذکور ہے۔ گویا انہوں نے خیال کیا کہ ممکن ہے میں ہی الفاظ کو ٹھیک ضبط میں نہ رکھ سکا ہوں۔ (بخاری، باب صلوٰۃ النوافل جماعۃ)

ایسا ہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کو قابل اعتراض

جانا۔ جب انہوں نے کہا کہ جس چیز کو آگ نے چھوا اس سے وضو لازم آتا ہے۔ (ترمذی، باب الوضوء مما مست النار)

اس قسم کی اور بھی کئی مثالیں مل سکتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی ممکن ہے اور کسی وقت ایسا بھی ہو گیا ہے کہ ایک بزرگ جو حدیث کی حفاظت میں سخت محتاط ہیں ان سے بھی خطا ہو گئی ہے اور جب صحابہ تک میں یہ جائز ہے تو بعد کے بزرگوں میں بھی ایسا ہونا قرین قیاس ہے۔

روایت بالمعنیٰ:

علاوہ اس کے کہ روایت کے بیان کرنے والے کو غلطی لگ سکتی ہے۔ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حدیث کی روایت میں روایت بالمعنیٰ سے بھی کام لیا گیا ہے۔ چنانچہ جہاں ایک طرف وہ لوگ بھی ہیں جن کے الفاظ حدیث کو حیرت انگیز طریق پر محفوظ رکھنے کی شہادتیں ہیں۔ دوسری طرف ایسے بزرگ بھی ہیں جو فرماتے ہیں کہ معنیٰ کو محفوظ رکھنا کافی ہے۔ جامع الترمذی کتاب العلل میں ایسے بہت سے اقوال نقل کیے ہیں۔ چنانچہ ایک طرف اگر یہ شہادتیں موجود ہیں کہ ابراہیم نخعی نے شہادت دی کہ ابوزرعہ بن عمرو بن جریر نے ایک دفعہ مجھ سے حدیث بیان کی تھی پھر میں نے اس سے دو سال کے بعد پوچھی تو اس نے ایک حرف بھی اس سے قطع نہ کیا۔ یا عبدالملک بن عمیر نے کہا کہ میں حدیث بیان کرتا ہوں اور اس سے کوئی حرف چھوڑتا نہیں ہوں۔ یا قتادہ نے کہا کہ جو کچھ

میرے کانوں نے سنا ہے اس کو میرے دل نے نگاہ رکھ لیا ہے۔تو دوسری طرف یہ بھی قول ہے:

[فَأَمَّا مَنْ أَقَامَ الْإِسْنَادَ وَحَفِظَهُ وَغَيَّرَ اللَّفْظَ فَإِنَّ هَذَا وَاسِعٌ عِنْدَ أَهْلِ الْعِلْمِ إِذَا لَمْ يَتَغَيَّرْ الْمَعْنَى.]

(العلل الصغير للترمذي:جلد1، صفحہ 746)

یعنی''جوکوئی اسناد کو قائم رکھے اور اس کو یاد رکھے اور الفاظ کو بدل دے تو یہ صورت اہل علم کے نزدیک بہت فراخ ہے بشرطیکہ معنی متغیر نہ ہوں۔''

یا واثلہ بن اسقع کا قول:[إِذَا حَدَّثْنَاكُمْ عَلَى الْمَعْنَىٰ فَحَسْبُكُمْ.] ''جب ہم تم سے حدیث بالمعنی کریں تو یہ تمہارے لیے کافی ہے۔''

یا محمد بن سیرین کا قول:[كُنْتُ أَسْمَعُ الْحَدِيْثَ مِنْ عَشَرَةٍ، اَللَّفْظُ مُخْتَلِفٌ وَالْمَعْنَىٰ وَاحِدٌ.] یعنی''میں دس آدمیوں سے حدیث سنتا تھا،الفاظ مختلف ہوتے تھے اور مطلب ایک ہوتا تھا۔''

یا ابن عون کا قول کہ ابراہیم نخعی اور حسن اور شعبی حدیث بالمعنی بیان کرتے تھے۔یا حسن کا قول کہ جب تم اصل مطلب حدیث کا پالو تو وہ کافی ہے:[إِذَا أَصَبْتَ بِالْمَعْنَىٰ أَجْزَأَكَ]

یا سفیان ثوری کا قول:[إِنْ قُلْتُ لَكُمْ: إِنِّي أُحَدِّثُكُمْ كَمَا سَمِعْتُ

فَلَا تُصَدِّقُوْنِیْ إِنَّمَا هُوَ الْمَعْنیٰ] ''اگر میں تم کو کہوں کہ میں تم سے بعینہٖ وہ بات کرتا ہوں جو میں نے سنی تو میری تصدیق نہ کرو۔ وہ صرف معنی ہوتا ہے۔''

اور وکیع کا قول ہے [إِنْ لَّمْ یَکُنِ الْمَعْنیٰ وَاسِعًا فَقَدْ هَلَكَ النَّاسُ.] اگر حدیث بالمعنی کی وسعت نہ ہوتی تو لوگ ہلاک ہوجاتے۔

پس معلوم ہوا کہ اگر ایک طرف حدیث کے الفاظ کو بعض حالات میں یاد رکھنے کی کوشش کی گئی ہے تو دوسری طرف کثرت سے یہ شہادت بھی موجود ہے کہ صرف مطلب کو بیان کر دینا بھی کافی سمجھا جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان احادیث میں جن کا تعلق اہم مسائل دینی سے ہے الفاظ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور دوسری احادیث میں بالمعنی روایت کر دینی بھی کافی سمجھی گئی ہے۔

صداقت حدیث کے پرکھنے کے لیے سب سے بڑا معیار:

پس باوجود راوی کے ثقہ ہونے کے بھی غلطی کا احتمال ہوسکتا ہے۔ اسی لیے بہت سے بزرگ حدیث کے نقل کرنے میں بہت محتاط پائے جاتے ہیں۔ ابن ماجہ کے باب التوقی فی الحدیث میں عمرو بن المیمون سے روایت ہے کہ وہ بلاناغہ ہر پنج شنبہ کی شام کو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس جاتے تھے (کیونکہ آپ جمعرات کے دن وعظ کیا کرتے تھے) اور انہوں نے کبھی حضرت عبداللہ کی زبان سے یہ نہیں سنا کہ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ یعنی رسول اللہ نے یوں فرمایا۔ اور پھر لکھا ہے کہ ایک دن ایسا انہوں

نے کہا تو بہت ہی مضطرب ہوئے اور فرمایا کہ شاید آپ نے اس سے کچھ کم فرمایا یا زیادہ یا اس کے قریب قریب یا اس سے مشابہ۔ ایسا ہی اسی باب میں محمد بن سیرین سے یہ روایت ہے:

[كَانَ (أَنَسُ بْنُ مَالِكٍ) إِذَا حَدَّثَ عَنْ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ حَدِيْثًا فَفَزِعَ مِنْهُ، قَالَ: أَوْ كَمَا قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ]

(كنز العمال: جلد10، صفحہ 296)

یعنی ''انس بن مالک جب رسول اللہ ﷺ کی کوئی حدیث بیان فرماتے تو آپ گھبرا جاتے اور کہتے کہ یوں فرمایا یا جیسا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہو۔''

اور اسی وجہ سے بعض صحابہ بہت کم حدیث بیان کرتے تھے۔ پس اگر ایک طرف حدیث کی عزت کرنا نہایت ضروری ہے کیونکہ وہ آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب ہے تو دوسری طرف چونکہ ایک بات کے درست طور پر نہ پہنچنے سے یا ایک بات کے بھول جانے سے یا الفاظ میں ادل بدل یا کمی بیشی ہو جانے سے غلطی کا احتمال پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لیے ان احادیث میں بھی جن کو صحیح کہا گیا ہے اور بالخصوص اس حصہ میں جس پر تعامل کی مہر صداقت نہیں لگی یا جس کو تواتر یا شہرت کا مرتبہ نہیں ملا۔ ایک اس سے بلند تر معیار کی ضرورت ہے جو ظن سے بالکل پاک ہو اور جس میں ادنیٰ شک کا بھی احتمال نہ ہو۔ اور

یہ معیار خدا کے فضل سے ہمارے ہاتھ میں موجود ہے۔ اور وہ قرآن شریف ہے۔ جس کے متعلق نہ صرف اس کی حفاظت کا ہی ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝۹﴾ [الحجر:9:15] بلکہ اس کے اندر سارے اصول کو واضح اور محکم الفاظ میں بیان کر کے ایک ایسا معیار ہمارے ہاتھ میں دے دیا جس کے ہوتے ہوئے ہم حق وحکمت کی راہ سے ادھر ادھر نہیں ہو سکتے۔

قرآن کو حدیث پر مقدم کرنے کی ضرورت:

پس درایت کی رو سے حدیث کو پرکھنے کے لیے سب سے بڑا معیار ہمارے ہاتھ میں قرآن کریم ہے جو تمام شکوک اور ظنوں کی آمیزش سے پاک ہے اور جس سے بڑھ کر کوئی یقینی اور قطعی کلام نہیں۔ وہی اصل بنیاد ہے اور ہر ایک چیز سب سے پہلے اسی پر پرکھی جائے گی۔ قرآن شریف تمام اسلامی فرقوں کے ہاتھ میں ایک ہے۔ روایات میں اختلاف ہے۔ قرآن کریم کی جو حفاظت ہوئی وہ حدیث کی نہیں ہوئی اور بوجہ وحی متلو ہونے کے اس کا مرتبہ بھی حدیث سے بڑھ کر ہے اور وہ سب پر مقدم ہے۔ خود صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی احادیث کو قرآن شریف پر پرکھا ہے۔ بلکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے قرآن کریم کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کچھ ارشاد فرمانے پر پیش کیا ہے۔

چنانچہ صحیح بخاری کتاب العلم میں ابن ابی ملیکہ کی روایت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے متعلق ہے: [كَانَتْ لَا تَسْمَعُ شَيْئًا لَا تَعْرِفُهُ إِلَّا رَاجَعَتْ فِيهِ.] (صحیح

البخاری:103) یعنی ''آپ کوئی بات آنحضرت ﷺ کے منہ سے نہ سنتی تھیں جس کو آپ پہچانتی نہ ہوں مگر اس میں آپ سے مراجعت کرتی تھیں۔'' اور اسی حدیث میں آگے آتا ہے کہ ایک دفعہ نبی ﷺ نے فرمایا:[مَنْ حُوسِبَ عُذِّبَ]جس کا حساب لیا گیا اس کو عذاب دیا جائے گا۔تو صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا:[أَوَ لَيْسَ يَقُولُ اللهُ تَعَالىٰ: ﴿فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيرًا ۝٨﴾] یعنی کیا اللہ تعالیٰ نہیں فرماتا کہ ''ایسے شخص کا حساب آسانی سے لیا جائے گا؟'' تو یہاں سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم ﷺ کے ایک ارشاد کو قرآن پر آپ کے روبرو عرض کیا اور آپ نے بھی اس کا جواب جو دیا وہ یہی ہے کہ اپنے قول میں اور قرآن شریف میں تطبیق کر کے دکھائی ہے۔ یہ نہیں کہا کہ تم میرے قول کو قرآن پر کیوں عرض کرتی ہو؟ بلکہ اپنے ہی قول کی توجیہ فرمائی[وَلٰكِنْ مَنْ نُوقِشَ الْحِسَابَ يَهْلِكْ]یعنی ''جس سے سختی سے حساب لیا جائے گا وہ ہلاک ہوجائے گا۔'' گویا بتادیا کہ [مَنْ حُوسِبَ]سے مراد وہ لوگ ہیں جن سے سختی سے حساب لیا جائے گا۔پس معلوم ہوا کہ خود نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ بھی قرآن شریف کو مقدم کرتے تھے اور حفظ مراتب یہی چاہتا ہے کہ قرآن شریف کو ہر چیز پر مقدم کیا جائے۔ کیونکہ اس کو وحی متلو ہونے کا بلند مقام حاصل ہے جو حدیث کو حاصل نہیں۔ اسی طرح پر جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے یہ حدیث بیان کی گئی کہ لوگوں کے نوحہ کرنے سے مردہ پر عذاب ہوتا ہے تو آپ نے قرآن شریف کی یہ آیت پڑھی ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ گویا

اس سے یہ استدلال کیا کہ نوحہ کرنے والوں کے گناہ کا اثر مردہ پر کس طرح پڑ سکتا ہے کیونکہ یہ قرآن شریف کے مخالف ہے۔ جس کے رو سے ایک کا بوجھ دوسرے پر نہیں پڑتا۔ چنانچہ صحیح مسلم میں یہ واقعہ كِتَابُ الْجَنَائِزِ میں مذکور ہے کہ جب حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ بات حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سامنے پیش کی گئی تو آپ نے آیت قرآن کو پیش کرنے کے بعد یہ بھی فرمایا:[إِنَّكُمْ لَتُحَدِّثُونِّي عَنْ غَيْرِ كَاذِبَيْنِ وَلَا مُكَذَّبَيْنِ وَلٰكِنَّ السَّمْعَ يُخْطِئُ] (صحیح مسلم:2190) یعنی ''تم ایسے لوگوں سے روایت کرتے ہو جو نہ جھوٹے ہیں اور نہ جھٹلائے گئے ہیں۔ لیکن بعض وقت سننے میں خطا ہو جاتی ہے۔'' ایسا ہی اور ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف ایک یہودی عورت کے متعلق یہ لفظ فرمائے تھے جس کا نوحہ کیا جا رہا تھا:[إِنَّهُمْ لَيَبْكُونَ عَلَيْهَا، وَإِنَّهَا لَتُعَذَّبُ فِي قَبْرِهَا] (صحیح البخاری: 1289) ''یہ اس پر روتے ہیں اور اس کو قبر میں عذاب ہو رہا ہے۔'' ایسا ہی واقعہ قلیب بدر والوں کے سننے کے متعلق لکھا ہے یعنی کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشرک مقتولین کے متعلق فرمایا تھا:[إِنَّهُمْ لَيَسْمَعُونَ مَا أَقُولُ] (صحیح البخاری: 3979) یعنی ''وہ سنتے ہیں جو میں کہتا ہوں۔'' تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ ان کو ٹھیک یاد نہیں رہا۔ آپ نے کہا تھا:[إِنَّهُمْ لَيَعْلَمُونَ أَنَّ مَا كُنْتُ أَقُولُ لَهُمْ حَقٌّ] (صحیح مسلم:2197) ''وہ جانتے ہیں کہ جو کچھ میں ان کو کہتا تھا وہ سچ نکلا۔'' اور پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ آیت پڑھی ﴿إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى﴾ ''تو مُردوں کو نہیں سنا

سکتا۔'' ان روایات کے متعلق ہمارا کچھ بھی خیال ہو، یہ ظاہر ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے قرآن شریف پر حدیث کو عرض کیا اور جہاں ظاہر طور پر اس کو مخالف پایا تو حدیث کو صحیح نہیں سمجھا۔ ایسی ہی اور بھی کئی روایتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ جب کسی روایت کو قرآن شریف کے خلاف سمجھتے تھے تو اسے ترک کر دیتے تھے۔

اس معیار سے نہ ہم صرف مسائل کے متعلق احادیث کی صحت کو ہی پرکھ سکتے ہیں بلکہ تاریخ کے متعلق، سیرت کے متعلق اور قصص کے متعلق بہت سی باتوں کے حل کرنے میں قرآن شریف ہمیں ایسی راہ پر چلاتا ہے کہ انسان ٹھوکر سے بچ سکتا ہے۔ یہ موقعہ تفصیل کا نہیں اجمالاً میں چند باتوں کا ذکر کرتا ہوں۔ قرآن شریف خود فرماتا ہے: ﴿اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ﴾ قرآن کریم کو جمع کرنا بھی اللہ تعالیٰ کا اپنا کام ہے۔ اور فرماتا ہے: ﴿وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝﴾ ہم قرآن شریف کی تحریف سے حفاظت کریں گے۔ ﴿لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ﴾ [حم السجدۃ: 42:41] باطل اس میں دخل نہیں پاسکتا۔ پس اگر کسی حدیث کا یہ مضمون ہو کہ فلاں آیت یا فلاں سورت قرآن شریف میں ہوتی تھی جواب نہیں تو وہ حدیث غلط ہے۔ مثلاً صحیح مسلم کی وہ حدیث جس میں آتا ہے کہ قرآن شریف میں کوئی سورت ہوتی تھی جس میں یہ لفظ آتے تھے: [لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيَانِ مِنْ مَالٍ لَابْتَغَى وَادِيًا ثَالِثًا وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ إِلَّا التُّرَابُ] (صحیح مسلم: 2462) یا وہ حدیث جس میں آتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ قرآن شریف میں عَشَرَ رَضْعَاتٍ کا ذکر تھا۔ پھر پانچ کا۔ (مسلم کتاب الرضاع)

اسی قسم کی دوسری احادیث باوجود مسلم میں ہونے کے قابل قبول نہیں ہیں۔ اور نہ صرف قرآن شریف سے ہی ان کا باطل ہونا ثابت ہوتا ہے بلکہ دوسری احادیث بھی جو تعداد میں زیادہ اور معتبر بھی زیادہ ہیں ان کی تردید کرتی ہے۔ یا مثلاً قرآن شریف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق فرماتا ہے ﴿اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝۴۱﴾ کہ وہ صدیق نبی تھا اور صدیق اس کو کہتے ہیں جو کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ اور ایک حدیث کہتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تین مرتبہ جھوٹ بولا۔ تو وہ حدیث قابل قبول نہیں۔ اس نبی کی طرف جس کو قرآن شریف صدیق کہتا ہے جھوٹ منسوب کرنے سے یہ بہت سہل ہے کہ ایک راوی کی طرف غلطی یا جھوٹ کو منسوب کیا جائے۔

جیسا کہ علامہ مازری نے اس روایت کے متعلق لکھا ہے جس میں ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ لفظ کہے تھے: [اقْضِ بَيْنِي وَبَيْنَ هَذَا الْكَاذِبِ الآثِمِ الْغَادِرِ الْخَائِنِ] (صحیح مسلم:4676)

علامہ مازری کہتے ہیں: [إِذَا انْسُدَّتْ طُرُقُ تَأْوِيْلِهَا نَسَبْنَا الْكَذِبَ إِلىٰ رُوَاتِهَا] یعنی ''جب اس حدیث کی تاویل کے سب رستے رک جائیں گے تو ہم راویوں کو جھوٹا کہیں گے۔'' (نووی شرح مسلم)

پس اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جھوٹا کہنے کی بجائے راویوں کو جھوٹا کہنا انسب ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جھوٹا کہنے کی بجائے کیوں راوی کو جھوٹا یا غلطی پر نہیں کہا جا سکتا۔ یا

مثلاً قرآن شریف صاف فرماتا ہے کہ ہدایت ہمیشہ بنی آدم کے لیے اترتی رہی اور وہی اس کے موردر ہے نہ دیگر حیوانات۔ تو اب ایک حدیث اگر یہ بیان کرے کہ ایک بندر کو دوسرے بندروں نے زنا کرنے کے جرم میں سنگسار کیا تھا تو اس حدیث کو غلط کہا جائے گا گو وہ بخاری میں ہی کیوں نہ ہو۔ اور فی الحقیقت یہ حدیث تو عامہ عقل انسانی کے بھی خلاف ہے یا مثلاً جب قرآن کریم اول سے آخر تک بتوں کی مذمت سے بھرا ہوا ہے اور کوئی حدیث یہ کہے کہ کبھی رسول اللہ ﷺ نے بتوں کی تعریف بھی کی تھی اور [تِلْكَ الْغَرَانِيْقَ الْعُلٰى] (مسند البزار: جلد 2، صفحہ 193) ان کے متعلق نازل ہوا تھا تو ایسی حدیث پھینکنے کے قابل ہے۔

خود حدیث سے قرآن کریم کے حدیث پر مقدم کیا جانے کا ثبوت:

علاوہ ان استدلالات کے جو صحابہ کے عمل سے اوپر کئے گئے ہیں جن سے قرآن شریف کا حدیث پر مقدم ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ترمذی اور ابوداؤد میں ایک حدیث ہے جو ہمارے مدعا کو صفائی سے صحیح ثابت کرتی ہے۔ یعنی یہ کہ قرآن شریف کو حدیث پر مقدم کرنا ضروری ہے۔ ترمذی اور ابوداؤد نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے ذیل کی حدیث روایت کی ہے:

عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ لَمَّا بَعَثَهُ إِلَى الْيَمَنِ قَالَ: "كَيْفَ تَقْضِي إِذَا عَرَضَ لَكَ قَضَاءٌ؟" قَالَ:

أَقْضِي بِكِتَابِ اللهِ. قَالَ: "فَإِنْ لَمْ تَجِدْ فِي كِتَابِ اللهِ.؟" قَالَ: فَبِسُنَّةِ رَسُولِ اللهِ ﷺ. قَالَ: "فَإِنْ لَمْ تَجِدْ فِي سُنَّةِ رَسُولِ اللهِ وَلَا فِي كِتَابِ اللهِ؟" قَالَ: أَجْتَهِدُ رَأْيِي وَلَا آلُو. فَضَرَبَ رَسُولُ اللهِ ﷺ صَدْرَهُ وَقَالَ: "الْحَمْدُ لِلهِ الَّذِي وَفَّقَ رَسُولَ رَسُولِ اللهِ لِمَا يُرْضِي بِهِ رَسُولَ اللهِ".

[سنن أبي داود: 3594؛ جامع الترمذي: 1327]

یعنی معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو یمن کی طرف (حاکم بنا کر) بھیجا۔ آپ نے فرمایا: ''جو کوئی مقدمہ تمہارے سامنے آئے تو کس طرح فیصلہ کیا کرو گے؟'' انہوں نے عرض کیا: میں اللہ کی کتاب سے فیصلہ کروں گا۔ فرمایا: ''اگر کتاب اللہ میں نہ پاؤ؟'' عرض کیا: تو رسول اللہ ﷺ کی سنت سے۔ فرمایا: ''اگر رسول اللہ کی سنت میں نہ پاؤ؟'' عرض کیا: تب میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور کوتاہی نہیں کروں گا۔ تب رسول اللہ ﷺ نے اس کے سینہ پر ہاتھ مارا اور فرمایا: ''سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے رسول اللہ کے رسول کو وہ توفیق دی جس پر اللہ کا رسول راضی ہے۔''

اس حدیث سے نہ صرف صحابہ کا عمل ہی قرآن شریف کو مقدم کرنے کا صراحت سے ثابت ہے۔ بلکہ خود رسول اللہ ﷺ کے استفسار پر یہ بات بیان کی جاتی ہے اور

رسول اللہ ﷺ صاف الفاظ میں اس پر اپنی رضامندی کا اظہار کرتے ہیں۔جس سے معلوم ہوا کہ خود آپ نے ہی صحابہ کو یہ طریق بتایا تھا کہ کسی مسئلہ کا فیصلہ کرنے کے لیے اول قرآن کریم کو دیکھو اس کے بعد حدیث کو اور اس کے بعد خود اجتہاد کرو۔ گویا جو مرتبہ اجتہاد کو بمقابلہ سنت یا حدیث نبی ﷺ حاصل ہے وہی حدیث یا سنت کو بمقابلہ قرآن کریم حاصل ہے۔ یہ حدیث اس سوال کا ہمیشہ کے لیے قطعی طور پر فیصلہ کرتی ہے اور اہل حدیث کے اس گروہ کی غلطی پر بین دلیل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ قرآن شریف بغیر حدیث کے ہماری سمجھ میں ہی نہیں آ سکتا۔ یہ سچ ہے کہ بہت سے فروعی مسائل میں اور بہت سی تفصیلات دینی میں قرآن شریف کے ساتھ ہم کو حدیث کی بھی ضرورت ہے۔مگر یہ درست نہیں کہ بغیر حدیث کے قرآن شریف ہمیں کچھ کام ہی نہیں دے سکتا۔ ورنہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ یوں نہ فرماتے کہ کسی مسئلے کا فیصلہ کرنے کے لیے میں قرآن شریف کی طرف رجوع کروں گا۔ وہاں صراحت سے نہ ملے تو پھر حدیث کی طرف اور نہ رسول اللہ ﷺ اس پر رضامندی ظاہر فرماتے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ قرآن و حدیث دونوں ہمارے دین کی بنیاد ہیں۔مگر مقدم کو مقدم اور مؤخر کو مؤخر نہ کرنا ویسی ہی غلطی ہے جیسے مؤخر کو بالکل ترک ہی کر دینا۔ایک افراط ہے تو دوسری تفریط۔اس تقدم کی طرف قرآن شریف نے خود بھی صفائی سے اشارہ کیا ہے کیونکہ ہمیشہ اللہ کی اطاعت کو رسول کی اطاعت پر مقدم کرکے بیان کیا ہے اور بار بار یونہی فرمایا ﴿اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ یا ﴿اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ الرَّسُوْلَ﴾ پس یوں قرآن و حدیث دونوں خود تصریح

سے قرآن کریم کے حدیث پر مقدم کرنے کو ضروری ٹھہراتے ہیں۔

قرآن کریم احادیث کے نقص کا علاج کرتا ہے:

غرض قرآن کریم ایک نہایت ہی اعلیٰ درجہ کا معیار حدیث کے پرکھنے کے لیے ہمارے ہاتھ میں دیتا ہے اور یہ ہمارے لیے مقام فخر ہے کہ اگر حدیث میں کسی قدر ظن اور احتمال کا پہلو ہو تو دوسرے مذاہب کی طرح وہ لاعلاج نہیں بلکہ اس ظن کو دور کرنے کے لیے ہمارے ہاتھ میں ایک نہایت قوی حربہ قرآن شریف موجود ہے جو شریعت کی اصلی بنیاد ہے۔ حدیث اپنی جگہ پر ہے۔ تعامل، تواتر اور شہرت نے اس کے ایک حصہ کو یقین کے مرتبہ تک پہنچا دیا ہے لیکن اس کا باقی حصہ بھی جس میں نہایت قیمتی جواہر ریزے ہیں ایسا نہیں کہ ایک عقلمند انسان اسے یوں ہی پھینک دے۔ وہ ایک عظیم الشان علم ہے۔ وہ بہت سے علوم کا سرچشمہ ہے۔ اس میں جو نقص نظر آتا ہے اس کی اصلاح کا سامان جہاں تک ہماری ضروریات متقاضی ہیں قرآن کریم میں موجود ہے۔ یوں تو دنیا کے بڑے بڑے مفید علوم ظن کا حصہ اپنے اندر رکھتے ہیں۔ خود علم طب کو لے لو۔ اس میں کس قدر ظن سے کام لیا جاتا ہے مگر وہ انسان صحیح الدماغ نہیں جو علم طب کو اس لیے پھینک دے کہ اس میں کچھ ظنیات بھی ہیں۔

غور وفکر کی ضرورت:

یہی حالت حدیث کی ہے۔ بلاشبہ اس میں ظنیات بھی ہیں مگر جو شخص کوشش کرے

گا وہ اس میں سے نہایت بیش قیمت معلومات نکال کر اسے دنیا کے لیے مفید بنا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں قسم کا سامان اسلام میں رکھا ہے۔ قرآن کریم کا حالانکہ ایک ایک لفظ کامل صحت کے ساتھ یقین کے مرتبہ پر پہنچا ہوا ہے مگر وہاں بھی اللہ تعالیٰ نے ایک حصہ محکمات کا اور ایک متشابہات کا رکھا ہے تا کہ متشابہات پر غور کر کے انسانوں کے ذہن تیز ہوں۔ حدیث میں اگر فروع کی تفصیلات موجود ہیں تو کچھ حصہ ظن کا ساتھ رکھ دیا ہے تا کہ صحیح نتیجہ پر پہنچنے کے لیے کچھ غور وفکر بکار ہو۔ حدیث پر قرآن کریم کو مقدم کر کے اصل گر بھی بتا دیا۔ باقی وجوہ جن سے حدیث پر جرح ہوسکتی ہے، خود محدثین نے بتا دی ہیں۔ اور وہ تمام اصول ہمارے لیے ہادی راہ ہیں۔ لیکن ان میں سے میں نے ایک بات کو خاص طور پر اس لیے انتخاب کیا ہے یعنی حدیث کو قرآن کریم کے ماتحت کرنا کہ اس زمانہ میں قرآن کریم کی عظمت ظاہر کرنے کے لیے سب سے بڑھ کر اسی کی ضرورت ہے۔ اور اس لیے بھی کہ جہاں بعض لوگوں نے حدیث کے مرتبہ میں تفریط کی ہے دوسری طرف بعض نے قرآن کریم کے برابر اس کو مرتبہ دے دیا ہے اور حفظ مراتب کو مدنظر نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج اگر صرف ونحو، منطق، فلسفہ بیان کی الجھنوں میں کچھ علم دین کا چرچا نظر آتا ہے تو صرف حدیث کے رنگ میں۔ قرآن کریم مسلمانوں کی درسگاہوں میں سے قریباً مفقود ہی ہو چکا ہے۔ اگر کچھ پڑھایا جاتا ہے تو وہ بھی صرف ونحو کی خاطر۔ حالانکہ ہماری تمام ترقیوں کا راز اور ہماری تمام کامیابیوں کی جڑ صرف

قرآن شریف تھا۔ اور اگر مسلمان پھر کچھ ترقی کر سکتے ہیں تو قرآن کریم کے ذریعہ سے ہی کر سکتے ہیں۔ اسی کے ماتحت اس کی تفسیر کے رنگ میں حدیث کو پڑھ کر اور بے بنیاد قصوں کو جو تفاسیر میں داخل ہو گئے ہیں ترک کر کے۔

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا﴾

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ○

نوٹ: معزز قارئین ہم نے کتاب مقام حدیث کی پروف ریڈنگ مکمل ذمہ داری کے ساتھ کی ہے۔ مگر اس کے باوجود دورانِ مطالعہ اگر کوئی پروف ریڈنگ کی غلطی آپ کی نظر سے گزرے تو براہ مہربانی ادارہ ہذا کو مطلع کیا جائے تا کہ آئندہ ایڈیشن میں اُسے درست کیا جا سکے۔